Scanned by CamScanner

اس کتاب میں اردو زبان کے تشکیلی اور ارتقائی دور سے متعلق لسانیاتی مسائل و مباحث کو مطالعے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ کتاب تحقیقی نوعیت کے آٹھ مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے مضمون میں اردو کے آغاز و ارتقا کے اُن تمام نظریوں سے بحث کی گئی ہے جو مولانا محمد حسین آزاد، حافظ محمود خاں شیرانی، سید محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر گیان چند جین، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری اور بہت سے دوسرے عالموں نے پیش کیے ہیں۔ دوسرے مضمون میں اردو زبان کے عہد بہ عہد ارتقا سے بحث کی گئی ہے، اور شمالی ہند میں اردو کے لسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کے ادبی ارتقا کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اردو کے قدیم سرمایۂ ادب کی لسانیاتی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعد کے مضامین میں اردو کے چند دیگر لسانیاتی مسائل مثلاً، اردو کی معکوسی (کوز) آوازوں کے ارتقا، قدیم اردو کی صوتیاتی خصوصیات، قدیم اردو اور ہریانی کے درمیان لسانیاتی مشابہت، قدیم اردو کے سرمایۂ الفاظ، نیز اردو رسم خط کے ارتقا اور املائی عہد بہ عہد تبدیلیوں سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں قدیم شعرائے دہلی کے دس مرثیے بھی شامل ہیں جن کا تعلق سترھویں صدی کے ربع چہارم سے ہے۔ محمد افضل افضل (وفات ۱۶۲۵ء) کی بکٹ کہانی کے بعد یہ مرثیے شمالی ہند میں ریختہ گوئی کا ایک اہم نمونہ خیال کیے جاتے ہیں۔

اردو کے آغاز، اس کے عہد بہ عہد ارتقا، اور اس میں ظہور پذیر ہونے والی لسانی تبدیلیوں، نیز اس کے آغاز و ارتقا کے مختلف نظریوں سے متعلق جو لسانیاتی ادب اردو میں پچھلے چند دہوں کے دوران معرض وجود میں آیا ہے، زیر نظر تصنیف اس میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

قیمت: ۵۴ روپے

# اردو کی لِسانی تشکیل

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی

حکومتِ اُتّر پردیش، لکھنؤ

کے

مالی تعاون سے شائع ہوئی

# اردو کی لِسانی تشکیل

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ
شعبۂ لسانیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

فیصل وِلا، سر سیّد نگر، علی گڑھ

URDŪ KĪ LISĀNĪ TASHKĪL
[ The Linguistic Formation of URDU ]
by
Dr. Mirza Khalil Beg
First published 1985
Price : Rs. 45.00

طبعِ اوّل : ۱۹۸۵ء

تعداد : ۶۰۰

قیمت : ۴۵ روپے

ناشر : ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ

## تقسیم کار

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ - 202001
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ - 202001
- انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، ۲۱۲ راؤز ایونیو، نئی دہلی - 110002

---

مطبع : شیروانی آفسٹ پرنٹرز دہلی

مشفق استاد

پروفیسر مسعود حسین خاں

کی خدمتِ گرامی میں

# ترتیب

# کتاب نامہ

زیرِ نظر تصنیف میرے اُن مضامین کا انتخاب ہے جن میں اردو زبان کے تشکیلی اور ارتقائی دَور سے متعلق لسانیاتی مسائل و مباحث کو مطالعے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ مضامین اگرچہ پچھلے چند برسوں کے دوران مختلف اوقات میں لکھے گئے، لیکن کتابی صورت میں پیش کرتے وقت ان پر نظرِ ثانی کی گئی ہے، اور بعض مضامین میں کافی ردو بدل کر کے انھیں از سرِ نو لکھا گیا ہے۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے، یہ کتاب میرے مضامین کا انتخاب ہے، مجموعہ نہیں۔ کیوں کہ بہت سے مضامین جو مواد و موضوع کی مناسبت سے اِس کتاب میں شامل کیے جا سکتے تھے، صفحات کی کمی کے باعث شامل نہیں کیے گئے۔

اردو کے لسانی مسائل پر اظہارِ خیال کا سہرا یوں تو انشا اللہ خاں انشا اور ان کے بعد مولانا محمد حسین آزاد کے سر ہے، لیکن اس موضوع پر جدید تحقیقی نقطۂ نظر سے ۱۹۳۰ء میں سب سے پہلے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے قلم اٹھایا۔ اس سے دو سال قبل، یعنی ۱۹۲۸ء میں حافظ محمود خاں شیرانی پنجاب میں اردو تصنیف کر چکے تھے اور یہ ثابت کر چکے تھے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی۔ اگرچہ شیرانی کا یہ نظریہ اب 'باطل' قرار دیا جا چکا ہے، تاہم انھوں

نے جو تحقیقی مواد اپنی مذکورہ کتاب میں یکجا کر دیا ہے، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ محمود شیرانی اور ڈاکٹر زور کے بعد جن محققین نے اردو کے لسانی موضوعات و مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا ہے ان میں پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر سید احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر عبدالستار دلوی، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں پروفیسر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو کی لسانی تشکیل اور اس کے آغاز و ارتقا کے مسائل و مباحث پر بڑی ژرف بینی اور دقتِ نظر کے ساتھ غور کیا ہے۔

اردو کے آغاز و ارتقا سے متعلق محمود شیرانی کی تصنیف پنجاب میں اردو (لاہور، ۱۹۲۸ء) اور ڈاکٹر زور کے تحقیقی کارنامے ہندستانی لسانیات (حیدرآباد، ۱۹۳۲ء) کے بعد پروفیسر مسعود حسین خاں کی مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو (دہلی، ۱۹۴۸ء)، اردو کے آغاز و ارتقا اور اس کی سلسلہ وار تاریخ پر جدید لسانیاتی تناظر میں، اور جدید تحقیقی نقطۂ نظر سے لکھی جانے والی ایک ایسی جامع اور مستند تصنیف ہے جس کی ہم پایہ کوئی دوسری تصنیف آج تک منظرِ عام پر نہیں آسکی۔ یہ بات بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ اردو میں ایسے عالموں کی تعداد کچھ کم نہیں، جنھوں نے اردو کے آغاز و ارتقا اور اس کے مولد و منشا کے بارے میں محض قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔ قیاس آرائیوں کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

یہ کتاب تحقیقی نوعیت کے آٹھ مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے مضمون میں اردو کے آغاز و ارتقا کے اُن تمام نظریوں سے مدلل بحث کی گئی ہے جن کا سلسلہ مولانا محمد حسین آزاد، سید سلیمان ندوی، حافظ محمود خاں شیرانی اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سے لے کر پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر گیان چند جین، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسرے مضمون میں اردو کے عہد بہ عہد ارتقا سے بحث کی گئی ہے، اور شمالی ہند میں اردو کے لسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کے ادبی ارتقا کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ نیز اردو کے قدیم سرمایۂ اد

کی لسانیاتی خصوصیات اور اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے مضمون میں اردو کی معکوسی (کوز) آوازوں کا تاریخی وتدریجی ارتقا دکھلایا گیا ہے۔ سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش سے ہوتی ہوئی یہ آوازیں جدید اردو میں بتدریج ارتقاپذیر ہوئی ہیں۔ چوتھا مضمون سترھویں صدی کی اردو کی چند صوتیاتی خصوصیات پر مشتمل ہے جو بعد کے دور میں مفقود ہوگئیں۔ پانچواں مضمون قدیم شعرائے دہلی کے دس مرثیوں پر مشتمل ہے۔ ان مرثیوں کا تعلق سترھویں صدی کے ربع چہارم سے ہے۔ امیر خسرو نے شمالی ہند میں ریختہ گوئی کی جو بنیاد تیرھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں قائم کی تھی اور جس کا نکھرا ہوا دہلی روپ محمد افضل افضل (وفات ۱۶۲۵ء) کی بکٹ کہانی کی صورت میں ظاہر ہوا تھا، یہ مراثی ریختہ گوئی کی اسی روایت کا شاندار تسلسل پیش کرتے ہیں۔ چھٹے مضمون میں قدیم اردو اور ہریانی کے لسانیاتی رشتوں پر غور کیا گیا ہے۔ اس تقابلی مطالعے سے پروفیسر مسعود حسین خاں کے اس نظریے کی توثیق ہوجاتی ہے کہ قدیم اردو پر ہریانی کے اثرات مرتسم تھے۔ ساتویں مضمون میں قدیم اردو کے سرمایۂ الفاظ سے بحث کی گئی ہے جس میں 'تتسم' اور 'تدبھو' الفاظ کا تناسب نسبتاً زیادہ تھا۔ آٹھویں اور آخری مضمون میں اردو رسم خط اور اس کے تحریری نظام کے عہد بہ عہد ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ قدیم مخطوطات کے حوالوں سے اردو کی املائی تبدیلیوں سے بھی بحث کی گئی ہے۔

یہ تمام مضامین اردو کے آغاز، اس کے عہد بہ عہد ارتقا، اور اس میں ظہور پذیر ہونے والی لسانی تبدیلیوں نیز اس کے آغاز وارتقا کے مختلف نظریوں سے متعلق اہم تحقیقی مواد فراہم کرتے ہیں۔ اس امر کا اندازہ اقتباسات کے علاوہ حواشی وحوالہ جات کی ان فہرستوں سے بھی بہ خوبی کیا جاسکتا ہے جو مضامین کے آخر میں دی ہوئی ہیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر محترم پروفیسر عبدالعظیم (صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے خلوص بے پایاں کا ذکر نہ کروں۔ موصوف نے ہر موقع پر میری ہمت افزائی

فرمائی اور میری علمی و تحقیقی کاوشوں کو بہ نظرِ تحسین دیکھا۔ یہ انھیں کی حوصلا فزائی ہے کہ یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر قارئین تک پہنچ سکی ہے۔

کتاب کی ترتیب اور اس کے مواد و موضوع سے متعلق بیش قیمت مشوروں کے لیے میں محبِ گرامی پروفیسر عبدالستار دلوی (صدرِ شعبۂ اردو، بمبئی یونیورسٹی) کا بہ دل ممنون ہوں۔ میرے بہت سے علمی استفسارات کے جوابات میرے بزرگ دوست ڈاکٹر سہیل بخاری نے مجھے کراچی سے ارسال فرمائے۔ میں ان کا بھی تہ دل سے شکرگزار ہوں۔

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومتِ اتر پردیش، لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ اس تعاون کے لیے میں کمیٹی کے ارباب، بالخصوص ڈاکٹر محمد رضوان علوی (چیرمین) کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ان تمام امور کے باوصف یہ کتاب شاید اتنی جلد اشاعت پذیر نہیں ہو سکتی تھی، اگر جناب سلطان احمد (خوشنویس) اور شری رتن پرکاش گپتا (لیتھو کلر پرنٹرز، علی گڑھ) کی ذاتی دلچسپی اور کوشش اس میں شامل نہ ہوتی، لہٰذا ان ہر دو احباب کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے۔

'فیصل وِلا'
سرسید نگر
علی گڑھ
۳ فروری ۱۹۸۵ء

مرزا خلیل بیگ

# اردو کے آغاز وارتقا کے نظریے

## ایک تنقیدی جائزہ

اُردو کے آغاز وارتقا کا سلسلہ عام طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کی یہاں سکونت پذیری سے جوڑا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کی آمد نے ہند آریائی زبانوں کی ترقّی کی رفتار کو تیز تر کر دیا، اور ان کے یہاں قیام کرتے ہی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں چمک اٹھیں؛ اردو بھی ان میں سے ایک ہے۔ مشہور محقّق اور ہند آریائی لسانیات کے ماہر ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹرجی (۱۸۹۰ - ۱۹۷۷ء) کا خیال ہے کہ اگر مسلمان ہندوستان میں نہ آتے تو جدید ہند آریائی زبانوں کے ادبی آغاز و ارتقا میں دو ایک صدی کی ضرور تاخیر ہو جاتی۔[1]

کارومنڈل، مالابار اور جنوبی ہند کے بعض دوسرے ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کی آمد و رفت سے قطع نظر سب سے پہلے مسلمان بڑی تعداد میں محمد بن قاسم

کی قیادت میں شمال مغرب کے بحری راستے سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور ۷۱۱ء میں سندھ کو فتح کر کے اُسے اسلامی حکومت کا ایک صوبہ بنا لیا۔ یہ مسلمان عرب تھے اور جو زبان بولتے ہوئے وہ یہاں آئے تھے وہ عربی تھی۔ چند وجوہات کے باعث وہ پورے ملک میں نہ پھیل سکے اور تقریباً تین سو سال تک وادیِ سندھ ہی میں مقیم رہے۔ اس طویل عرصے کے دوران عربوں اور مقامی باشندوں کے درمیان میل جول اور سماجی روابط بڑھتے رہے یہی وجہ ہے کہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء-۱۹۵۳ء) اپنی تصنیف نقوشِ سلیمانی (اعظم گڑھ، ۱۹۳۹ء) میں اردو کی جائے پیدائش سندھ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں، اس لیے قرینِ قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔"[۲]

لیکن اگر خالص علمی اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس بیان میں ذرا بھی صداقت نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے سندھ کی تہذیب و معاشرت کے علاوہ وہاں کی زبان کو بھی متاثر کیا، لیکن وہ زبان اردو نہ تھی، بلکہ وہ اس زبان کی قدیم شکل تھی جو آج سندھی کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھی زبان میں ہمیں عربی کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔ اس زبان پر عربی کا اثر یہیں تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس نے عربی زبان کے رسمِ خط کو بھی اپنا لیا۔ علمی اعتبار سے ہم بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عربوں نے وادیِ سندھ میں اپنے قیام کے دوران کسی نئی زبان کو جنم نہیں دیا، ہاں اس خطۂ ارض میں بولی جانے والی زبان کو متاثر ضرور کیا۔

۲

دوسری بار مسلمان دسویں صدی عیسوی کے رُبعِ آخر میں غزنی کے بادشاہ امیر سبکتگین[۳] کی سرکردگی میں درۂ خیبر سے ہو کر پنجاب میں داخل ہوئے۔ امیر سبکتگین کی وفات (۹۹۷ء) کے بعد اس کے فرزند و جانشین سلطان محمود غزنوی[۴] (وفات ۱۰۳۰ء) کے پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر پے در پے حملوں (۱۰۰۱ء تا ۱۰۲۷ء) کا سلسلہ شروع ہوا۔ غزنوی سلطنت کے قیام کے بعد دھیرے دھیرے مسلمان سارے پنجاب میں پھیل گئے۔ یہ وادیِ سندھ میں وارد ہونے والے عرب مسلمانوں کے برخلاف فارسی بولتے ہوئے آئے تھے۔ ان میں سے کچھ کی مادری زبان ترکی بھی تھی، کیوں کہ سلطان محمود غزنوی خود ایک ترکی النسل بادشاہ تھا۔ پنجاب میں مسلمانوں نے تقریباً دو سو سال تک قیام کیا۔ اس مدت میں ان کے اور اہلِ پنجاب کے درمیان مضبوط سماجی روابط قائم ہو گئے۔ اسی گہرے میل جول اور مضبوط سماجی روابط کی بنیاد پر حافظ محمود خاں شیرانی (۱۸۸۰ - ۱۹۴۶ء) نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ زبان جسے ہم 'اردو' کہتے ہیں سرزمینِ پنجاب میں پیدا ہوئی اور وہیں سے ہجرت کر کے دہلی پہنچی۔

حافظ محمود خاں شیرانی نے اس نظریے کو اپنی تصنیف پنجاب میں اردو (لاہور، ۱۹۲۸ء) میں بڑے مفصّل اور مدلّل انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے، اور چوں کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔"[۵]

محمود خاں شیرانی نے اپنے اس بیان کے ثبوت میں بعض تاریخی دلائل پیش کرنے کے علاوہ پنجابی اور اردو، بالخصوص قدیم دکنی اردو کی مشترک لسانی خصوصیات کا

بھی ذکر کیا ہے۔ پنجابی اور اردو صرف و نحو کے تقابلی مطالعے کے بعد وہ اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کی جائے پیدائش پنجاب ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

"ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تعریف کا اتحاد اسی ایک نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے، اور جب سیانی ہو گئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔" [۶]

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی تحقیقی تصنیف مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو (دہلی، ۱۹۴۸ء) میں محمود شیرانی کے اس نظریے کی بڑی خوبی کے ساتھ 'تنقید' کی ہے اور متعدد مثالوں اور دلیلوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ قدیم اردو اور دکنی کی جو خصوصیات محمود شیرانی پنجابی سے منسوب کرتے ہیں وہ دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں بالخصوص ہریانی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں قدیم اردو کا "پنجابی پن" اس کا "ہریانی پن" بھی ہے۔

غالباً اِس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ اردو کے پنجابی سے مشتق ہونے یا سرزمینِ پنجاب سے منسوب ہونے کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے جسے محمود شیرانی نے پیش کیا ہے۔ جیسا کہ شیرانی نے پنجاب میں اردو (لاہور، ۱۹۲۸ء) میں "عرضِ حال" کے عنوان سے خود اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اس سے پہلے شیر علی سرخوش اپنے تذکرے اعجازِ سخن (لاہور، ۱۹۲۳ء) میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ بہ قولِ پروفیسر مسعود حسین خاں، جارج گریرسن (۱۸۵۱ - ۱۹۴۱ء) نے بھی اپنی تحریروں میں اردو کے "پنجابی پن" پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ [۷]

۱۹۲۸ء میں شیرانی کی پنجاب میں اردو کی اشاعت سے دو سال قبل ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹرجی (۱۸۹۰ - ۱۹۷۷ء) کی تحقیقی اور عالمانہ تصنیف دی اوریجن اینڈ

ڈیولپمنٹ آف دی بنگالی لینگویج (کلکتہ، ۱۹۲۶ء) شائع ہوئی جس کی جلد اوّل کے مقدمے میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نواحِ دہلی کی موجودہ بولیوں کا تشخص مسلمانوں کے داخلۂ دہلی کے وقت تک نہیں ہوا تھا، اور لاہور تا الٰہ آباد تقریباً ایک ہی قسم کی زبان رائج تھی۔ بعد کو اس نقطۂ نظر کی تائید ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (۱۹۰۵ء - ۱۹۶۲ء) نے بھی کی جنھوں نے علاقے کی توسیع الٰہ آباد تا شمال مغربی سرحدی صوبہ کر دی اور اردو کو اس زبان پر مبنی بتایا جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔[۸]

بہ قولِ ڈاکٹر زور، پنجاب میں اردو کی اشاعت سے ایک سال قبل وہ اردو کے آغاز و ارتقا کے موضوع پر لندن یونیورسٹی میں لسانی تحقیقات میں مصروف تھے۔ ان کے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی کہ "اردو پنجاب میں بنی"۔[۹] اس نظریے کی مزید توثیق اور وضاحت انھوں نے اپنی تصنیف ہندوستانی فونےٹکس (پیرس، ۱۹۳۰ء) میں اور بعد کو ہندوستانی لسانیات (حیدرآباد، ۱۹۳۲ء) میں بھی کی ہے۔ آخر الذکر کتاب میں وہ لکھتے ہیں:

> "اردو کا سنگِ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتحِ دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی تھی، جب تک کہ مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت نہ بنا لیا۔ اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم 'نئے ہند آریائی دور' میں اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہدِ حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الٰہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔"[۱۰]

ٹی۔ گراہم بیلی (وفات ۱۹۴۲ء) نے جو پنجابی زبان کے ایک مستند عالم سمجھے جاتے

تھے، محمود شیرانی کے خیال سے پورے طور پر اتفاق کرتے ہوئے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلّے میں لکھا ہے:

"اردو ۱۰۲۷ء کے لگ بھگ لاہور میں پیدا ہوئی، قدیم پنجابی اس کی ماں ہے اور قدیم کھڑی بولی سوتیلی ماں۔ برج سے براہِ راست اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ مسلمان سپاہیوں نے پنجابی کے اس روپ کو جو ان دنوں دہلی کی قدیم کھڑی بولی سے زیادہ مختلف نہ تھا اختیار کیا اور اس میں فارسی الفاظ اور فقرے شامل کر دیے۔" [۱۱]

گراہم بیلی نے اِس نقطۂ نظر کی تائید اپنی تصنیف اے ہسٹری آف دی اردو لٹریچر (لندن، ۱۹۳۲ء) میں بھی کی ہے۔[۱۲]

۳

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی تصنیف مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو (دہلی، ۱۹۴۸ء) میں اردو کے پنجابی زبان سے ماخوذ ہونے کے نظریے کی 'تنقید' کی ہے اور دکنی کی لسانی خصوصیات کا نواحِ دہلی کی بولیوں کے ساتھ تقابل سے ایک نئے لسانی نظریے کی 'تشکیل' کی ہے۔ اردو کی ابتدا کا سراغ پانے کے لیے انھوں نے نواحِ دہلی کی بولیوں کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے شہرِ دہلی چار بولیوں کے سنگم پر واقع ہے۔ یہ بولیاں ہیں، ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا اور میواتی۔ ہریانی، دہلی کے شمال مغرب میں بولی جاتی ہے۔ دراصل یہ شہر جمنا کے مغرب میں ہریانی سے گھرا ہوا ہے۔ جمنا اور دہلی کے شمال مشرق میں کھڑی بولی کا چلن ہے۔ دہلی کے جنوب مشرق میں کچھ دور چل کر برج بھاشا مل جاتی ہے اور دہلی کے جنوب مغربی حصّے میں راجستھانی کی ایک بولی میواتی بولی جاتی ہے۔ بہ قولِ پروفیسر مسعود حسین خاں اردو کے ارتقا میں اِن تمام بولیوں کے اثرات مختلف زمانوں میں پڑتے رہے ہیں۔

ہریانی نے قدیم اردو کی تشکیل میں حصّہ لیا، کھڑی بولی نے جدید اردو کا ڈول تیار کیا، برج بھاشا نے اردو کا معیاری لب و لہجہ متعین کرنے میں مدد دی اور میواتی نے قدیم اردو پر اپنے اثرات چھوڑے۔ اس ضمن میں مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو کے ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

• "قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست ہریانی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں، اور جب پندرہویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام مقبول ہو جاتی ہے تو سلاطینِ دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعے درست ہوتی ہے۔"[۱۳]

• "قدیم اردو جمنا پار کی ہریانی بولی سے قریب تر تھی۔ جدید اردو اپنی صرف و نحو کے اعتبار سے مراد آباد اور بجنور کے اضلاع کی بولی سے قریب تر ہے۔ برج بھاشا نے بعد کو اردو کا معیاری لب و لہجہ متعین کرنے میں ضرور مدد دی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سکندر لودھی کے عہد سے لے کر شاہ جہاں کے زمانے تک آگرہ ہندوستان کا پایۂ تخت رہا ہے۔"[۱۴]

• "جدید اردو کا معیاری لہجہ برج بھاشا کا تتبع کرتا ہے۔"[۱۵]

• "راجپوتوں کی دِلّی، ڈِلّی یا اپ بھرنش ادبیات کی "ڈھلّی" ہریانے کے علاقے میں تھی جس سے کھڑی بولی کی بہ نسبت میواتی زیادہ قریب تھی۔۔۔۔ بعد کو مغلوں کے عہد میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات اس پر غالب آجاتے ہیں۔"[۱۶]

نواحِ دہلی کی ان بولیوں کے تقابلی مطالعے اور قدیم دور کے تحریری مواد کے لسانیاتی تجزیے سے پروفیسر مسعود حسین خاں نے جس بنیادی نظریے کی تشکیل کی ہے

وہ یہ ہے کہ نواحِ دہلی کی یہ بولیاں اردو کا "اصل منبع اور سرچشمہ" ہیں، اور "حضرتِ دہلی" اِس کا صحیح "مولد و منشا" [۱۷] لیکن اردو کی ابتدا اس وقت تک ممکن نہ ہو سکی جب تک کہ شہاب الدین محمد غوری (وفات ۱۲۰۶ء) نے ۱۱۹۳ء میں دہلی کو فتح کر کے اسے اپنا پایۂ تخت نہیں بنا لیا۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پروفیسر مسعود حسین خاں کی اِس لسانی تحقیق سے تقریباً ۱۵ سال قبل یعنی ۱۹۳۰ء کے آس پاس ژول بلاک (۱۸۸۰ - ۱۹۵۳ء) اپنی تحریروں میں اردو پر ہریانی کے اثرات کی نشاندہی کر چکے تھے [۱۸]۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے صرف ہریانی کی اہمیت پر زور دیا ہے اور نواحِ دہلی کی دیگر بولیوں کو وہ نظر انداز کر گئے ہیں۔

ژول بلاک (۱۸۸۰ - ۱۹۵۳ء) کے بعد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (۱۹۰۵ - ۱۹۶۲ء) نے بھی اردو پر ہریانی کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ وہ اپنی تصنیف ہندستانی لسانیات (حیدرآباد، ۱۹۳۲ء) میں رقم طراز ہیں:

> "یہاں ایک اور بات مدِنظر رکھنی چاہیئے کہ اردو پر بانگرو یا ہریانی زبان کا بھی قابلِ لحاظ اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان دہلی کے شمال مغرب میں انبالہ کے اطراف اس علاقے میں بولی جاتی ہے جو پنجاب سے دہلی آتے ہوئے راستے میں واقع ہے۔۔۔۔ فاتح و مفتوح کے میل جول سے جو زبان بنتی چلی آ رہی تھی اس میں ہریانی عنصر بھی شامل ہو گیا۔" [۱۹]

لیکن ژول بلاک اور ڈاکٹر زور کی تحریروں میں ہریانی کی اہمیت سے متعلق محض اشارے ہی تھے۔ ہریانی مواد کے لسانیاتی تجزیوں کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کا کام سب سے پہلے پروفیسر مسعود حسین خاں نے ہی انجام دیا۔ حیرت کی بات ہے کہ ڈاکٹر زور نے، جو اردو پر ہریانی کے اثرات کی طرف توجہ مبذول کرا چکے تھے، پروفیسر

مسعود حسین خاں کے اس لسانی نظریے کی اپنے ایک مضمون "اردو کی ابتدا" میں سخت تنقید کی ہے۔ وہ کافی بحث و تمحیص کے بعد جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ:

> "ہریانی زبان کی پیدائش اردو کی پیدائش کے بعد عمل میں آئی، اور اگر قدیم دکنی اردو کی بعض خصوصیات ہریانی زبان میں ملتی جلتی ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اردو ہریانی سے بنی بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اردو اور ہریانی دونوں کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔" ۲۰

پروفیسر گیان چند جین نے بھی اپنے ایک حالیہ مضمون میں پروفیسر مسعود حسین خاں کے اس نظریے سے عدم اتفاق کیا ہے۔ ۲۱

## ۴

فتح دہلی (۱۱۹۳ء) کے پورے ایک سو سال بعد علاء الدین خلجی (وفات ۱۳۱۶ء) کی فوجوں کے ساتھ اردو دکن پہنچتی ہے۔ علاء الدین خلجی نے ۱۲۹۴ء میں دیوگری کو فتح کیا اور اس کے فوجی سپہ سالار ملک کافور نے اسی طرح کے کئی اور کامیاب حملے دکن پر کیے۔ علاء الدین خلجی کے بعد محمد تغلق (وفات ۱۳۵۱ء) نے ۱۳۲۷ء میں دکن پر چڑھائی کی اور بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اپنا پایۂ تخت دہلی سے دولت آباد (دیوگری) منتقل کر دیا جس کی وجہ سے دہلی کی ایک کثیر آبادی ترکِ وطن کر کے دولت آباد آ گئی۔ کچھ عرصے کے بعد جب دارالسلطنت دولت آباد سے پھر دہلی منتقل ہوا تو بہت سے خاندانوں نے وہاں سے واپس جانا پسند نہیں کیا اور وہیں کے ہو رہے۔ جو زبان وہ لوگ اپنے ساتھ دکن لے گئے تھے وہ ابھی ناپختہ تھی اور اپنی نشو و نما کے ابتدائی مراحل سے گذر رہی تھی۔ ۱۳۴۷ء میں جب دکن کی خود مختار بہمنی سلطنت کا گلبرگے میں قیام عمل میں آیا تو اردو کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہوا لیکن اصل قدردانی

۱ سے اس وقت نصیب ہوئی جب بہمنی سلطنت (۱۳۴۷ءتا ۱۵۲۷ء) ٹوٹ کر پانچ الگ الگ حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ان میں سے بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت (۱۴۹۰ءتا ۱۶۸۶ء) اور گول کنڈے کی قطب شاہی سلطنت (۱۵۱۲ءتا ۱۶۸۷ء) کے فرماں روا اردو کے خاص طور پر قدر دان بنے اور اس کے علم و ادب کی سرپرستی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ دربار سے باہر صوفیوں اور بزرگوں نے بھی اس کی سرپرستی کی اور اسے دین کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بنایا۔

دکن میں اردو کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق بعض محققین نے بڑے غلط اور بے بنیاد نظریات پیش کیے ہیں۔ جس طرح سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) اردو کی جائے پیدائش سندھ قرار دیتے ہیں کیوں کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں داخل ہوئے تھے۔ اسی طرح بعض اہلِ علم نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اردو دکن میں پیدا ہوئی، کیوں کہ مسلمان اوّلاً علاقۂ سندھ کے علاوہ سواحلِ مالابار اور کارو منڈل پر بھی نمودار ہوئے تھے۔ چوں کہ عربوں کا مقصد سیر و تفریح نہیں بلکہ تجارت کو فروغ دینا تھا، اور بعد میں اشاعتِ دین بھی ان کا مقصد بن گیا تھا، اس لیے وہ ان سواحل سے ہو کر اندر خشکی کی جانب بڑھتے گئے۔ ان عربوں اور مقامی باشندوں کے درمیان میل جول اور سماجی روابط بھی بڑھتے گئے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اسی میل ملاپ اور سماجی اختلاط کی وجہ سے ایک نئی زبان معرضِ وجود میں آئی جو موجودہ اردو کی قدیم شکل تھی۔ دکن میں اردو کے مصنف نصیر الدین ہاشمی اسی خیال کے ہم نوا نظر آتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> "بعض علما اردو کی پیدائش علاقۂ سندھ کو بیان کرتے ہیں۔ اگر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر مالابار کا علاقہ بھی کھڑی بولی اردو کی پیدائش کا خطّہ کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ فتحِ سندھ سے بہت عرصہ پیشتر

اس علاقے میں عرب آباد تھے۔'' ۲۲؎

چند سال قبل بنگلور کی ڈاکٹر آمنہ خاتون نے دکنی کی ابتدا (۱۹۷۰ء) کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں انھوں نے دکنی کو اردو سے ایک علاحدہ زبان قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں دکنی نہ تو دہلی میں بولی جانے والی زبان سے ماخوذ ہے اور نہ ہی وہ کسی دوسری جگہ سے چل کر دکن پہنچی ہے، بلکہ اس کی ابتدا سرزمینِ دکن سے ہوئی ہے اور وہ یہیں نشو و نما پاکر پروان چڑھی ہے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون کے خیال کے مطابق مسلمانوں کے دہلی پہنچنے سے کم از کم ساڑھے پانچ سو سال پہلے سے دکن میں مرہٹی زبان میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش سے دکنی کی داغ بیل پڑنا شروع ہوگئی تھی۔ دکنی کی ابتدا سے متعلق ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے:

''تاریخ شاہد ہے کہ بندرگاہ تھانہ پر قبضے (سنہ ۶۳۶ء) کے زمانے سے دولت آباد کے پایۂ تخت قرار پانے (۱۳۲۷ء) کے زمانے تک مہاراشٹر کے مسلمانوں کی زبان پہلے بلاشبہ شورسینی اپ بھرنش اور بلاشبہ اسی کی مقامی پیداوار مراٹھی تھی اور اس کے شواہد موجود ہیں کہ شورسینی اپ بھرنش اور مرہٹی میں عربی اور فارسی کی سات سو سال کے عرصے میں بتدریج آمیزش اور پڑوس کی جدید آریائی زبانوں سے لین دین اور راہ رسم کی وجہ سے مرہٹی کے دوش بدوش دکنی کی نشو و نما ہوئی۔'' ۲۳؎

اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں سنیتی کمار چٹرجی، محمود شیرانی، ڈاکٹر زور، پروفیسر مسعود حسین خاں اور دیگر عالموں کے تحقیقی نظریات کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے وہ دکنی کی ابتدا میں ایک جگہ یہ عبارت لکھتی ہیں:

''یہ فرض کرنا کہ دکن میں ان پورے پونے سات سو سال کے عرصے میں مرہٹی میں عربی اور فارسی کے شمول اور راجستھانی، گجراتی اور برج بھاشا کے ماحول

کے اثر سے دکنی وجود میں نہیں آئی بلکہ دفعتہً ۱۳۲۷ء میں دلی کی آبادی کے
دولت آباد میں منتقل ہو جانے سے موجود ہو گئی، کسی زبان کے وجود میں آنے
اور اس کے نشو و نما پانے کے کل مسلّمہ لسانیاتی اصولوں کے سراسر خلاف ہے
اور اس حقیقت سے چشم پوشی ہے کہ دولت آباد، گلبرگہ اور بیدر جو سلطنتِ
دہلی کے مرکزِ حکومت تھے مرہٹواڑی میں واقع تھے اور یہاں کے باشندوں
کی زبان مرہٹی تھی۔" ؁۲۴

اُردو کے دکن میں پیدا ہونے کا نظریہ کسی بھی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کیوں کہ جنوبی ہند کے بحری راستوں سے جو عرب یا عرب مسلمان دکن میں آئے ان کا زیادہ تر سابقہ دراویدی خاندان کی زبانوں ملیالم، تامل اور کنٹریا ان کی قدیم شکلوں سے پڑا۔ دراویدی زبانوں اور عربی (جو ایک بالکل علاحدہ لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے) کے میل سے ایک ایسی زبان کے معرضِ وجود میں آنے کی بات سوچنا جو ایک تیسرے لسانی خاندان ہند آریائی سے تعلق رکھتی ہو، محض قیاس آرائی ہی ہو سکتی ہے۔

۵

اُردو کی ابتدا کے بارے میں محمد حسین آزاد (۱۸۳۲ - ۱۹۱۰ء) نے آبِ حیات میں جو بات کہی ہے اس کا بھی ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے
نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔" ؁۲۵

اس نظریے کی کسی زمانے میں علمی حلقوں میں بہت دھوم تھی اور برج بھاشا کو عام طور پر اردو کی ماں سمجھا جانے لگا تھا۔ آزاد کا نام کچھ اس نظریے کی وجہ سے بھی خاصا مشہور ہوا۔ اس نظریے کی تائید اور تردید میں اُس وقت سے اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کے برج سے ماخوذ ہونے کا نظریہ

سب سے پہلے ہند آریائی لسانیات کے ایک بڑے ماہر روڈولف ہیورنلے نے پیش کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اردو مقابلتہً حال کی پیداوار ہے۔ دہلی کے نواح میں، جو مسلم اقتدار کا مرکز تھا اردو بارہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی۔ یہ علاقہ برج، مارواڑی، پنجابی کے لیے سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقامی باشندوں، در مسلمان سپاہیوں کے اختلاط و ارتباط سے ایک ملی جلی زبان وجود میں آئی جو صرفی، نحوی اصول کی حد تک برج ہے، اگرچہ اس میں پنجابی اور مارواڑی کی آمیزش بھی ہے۔ اس کے کچھ الفاظ دیسی ہندی ہیں اور کچھ بدیسی یعنی فارسی و عربی۔" ۲۶؎

محمد حسین آزاد اور ہیورنلے کے علاوہ کئی اور مصنفین بھی اردو کو برج کے ساتھ منسوب کرنے میں پیش پیش رہے ہیں، مثلاً آزاد سے قبل میر امن، سرسید احمد خاں اور امام بخش صہبائی، اور آزاد کے بعد سید شمس اللہ قادری کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں جن کی تحریروں میں اس نظریے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ سید شمس اللہ قادری رسالۂ تاجِ اردو کے "قدیم نمبر" میں لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیّر شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصہ کے بعد اُردو زبان کی صورت اختیار کرلی۔" ۲۷؎

اردو کے برج بھاشا سے نکلنے کے نظریے کی تنقید اور تردید محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو (لاہور، ۱۹۲۸ء) میں، پروفیسر مسعود حسین خاں نے مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو (دہلی، ۱۹۴۸ء) میں، اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے داستانِ زبان اردو (دہلی، ۱۹۶۱ء) میں نہایت کھُل کر کی ہے۔ ان محققین نے برج بھاشا اور اردو

کے تقابلی مطالعے اور لسانیاتی تجزیے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچادی ہے کہ ان دونوں زبانوں میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں بلکہ بہنوں کا رشتہ ہے۔

اردو کے برج سے نکلنے کا لسانیاتی جواز تو کوئی نہیں ہو سکتا، تاہم ہیورنلے، آزاد اور اردو کے بعض دیگر مصنفین کے ذہن میں یہ خیال دو وجہوں سے پیدا ہوا ہوگا۔ اول برج بھاشا کی امتیازی حیثیت اور غیر معمولی اہمیت و مقبولیت۔ دوم آگرے کا پایۂ تخت قرار پانا۔ سنگیت اور شاعری کی زبان ہونے کی وجہ سے برج بھاشا اپنے علاقے سے باہر بھی کافی مقبول تھی۔ امیر خسرو (۱۲۵۳ - ۱۳۲۵ء) نے اپنی پہیلیوں، مکرنیوں اور گیتوں میں جو زبان استعمال کی ہے اس میں کھڑی بولی کے علاوہ برج بھاشا کے عناصر بھی کافی حد تک نمایاں ہیں۔ ان کی بعض پہیلیاں خالص برج بھاشا میں ہیں اور گیتوں کی زبان عام طور پر معیاری برج بھاشا ہے۔ نامدیو (۱۲۷۰ - ۱۳۵۰)، کبیر داس (۱۳۹۸ - ۱۵۱۸ء) اور گرو نانک (۱۴۶۹ - ۱۵۳۹ء) کے کلام میں بھی برج بھاشا کے نمونے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ سلطان بہلول لودھی (وفات ۱۴۸۰ء) کے بسائے ہوئے شہر آگرہ کو جب اس کے فرزند و جانشین سکندر لودھی (وفات ۱۵۱۷ء) نے اپنا پایۂ تخت قرار دیا[۲۸] تو برج بھاشا کو پھلنے پھولنے کا اور بھی موقع ملا۔ اکبر (وفات ۱۶۰۵ء)، جہاں گیر (وفات ۱۶۲۷ء) اور شاہ جہاں (وفات ۱۶۶۶ء) کے عہد میں اسے خاص طور پر فروغ حاصل ہوا۔ ادبی اظہار کے لیے شمالی ہند کی یہ ایک اعلا ترقی یافتہ زبان تصور کی جانے لگی۔ اکبر کے دربار کا مشہور شاعر عبدالرحیم خان خاناں (۱۵۵۳ - ۱۶۲۶ء) برج بھاشا کا مشہور شاعر گذرا ہے۔ اکبر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے بھی برج بھاشا میں دوہے لکھے ہیں۔ شاہ جہاں نے ۱۶۴۸ء میں جب اپنا پایۂ تخت آگرے سے دہلی منتقل کیا تو برج بھاشا کے اثرات رفتہ رفتہ زائل ہونے لگے، لیکن اورنگ زیب (وفات ۱۷۰۷ء) کے عہد میں تحفۃ الہند (۱۶۷۶ء) کے

تصنیف کیے جانے سے اس دور میں دہلی میں برج بھاشا کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تحفۃ الہند برج بھاشا کی قواعد ہے جو مرزا خاں نے غالباً مغل شہزادوں کو ہندی پڑھانے کی غرض سے فارسی زبان میں لکھی تھی۔

یہ بات بہ خوبی واضح ہو جاتی ہے کہ برج بھاشا کو نواحِ دہلی کی تمام بولیوں میں ایک خاص مرتبہ حاصل تھا۔ ہر اہلِ علم اس کی اہمیت اور مقبولیت سے واقف تھا۔ لہٰذا محمد حسین آزاد (۱۸۳۲ - ۱۹۱۰ء) کا اردو کو برج کے ساتھ منسوب کرنا کوئی تعجب خیز امر نہیں۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے یہ بالکل درست فرمایا ہے کہ آزاد نے محض "روایتاً" برج کو اردو کا ماخذ بتایا ہے۔[۲۹] کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ آزاد ماہرِ السنہ نہیں تھے۔ وہ نواحِ دہلی کی بولیوں کے نازک اختلافات سے بھی واقف نہیں تھے، اسی لیے انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں نہ تو کوئی دلیل پیش کی اور نہ ہی لسانی حقائق و شواہد سے بحث کی۔

۶

اُردو کے آغاز سے متعلق ایک اور نظریہ اردو کے کھڑی بولی سے بننے کا بھی ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری (۱۹۰۸ - ۱۹۷۳ء)، ڈاکٹر سہیل بخاری اور ان کے تتبع میں پروفیسر گیان چند جین کھڑی بولی کو اردو کی اصل قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے۔ کھڑی بولی دہلی اور مغربی یوپی کی بولی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ یہ کہہ سکے کہ یہ پنجاب کی زبان پنجابی کی اولاد ہے۔ اگر کھڑی بولی پنجابی سے نہیں نکلی تو اردو بھی پنجابی سے نہیں نکلی۔"[۳۰]

وہ مزید لکھتے ہیں:

" میں شوکت سبزواری اور سہیل بخاری سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ لسانیاتی نقطۂ نظر سے اردو، ہندی، کھڑی بولی ایک ہیں۔ اردو کھڑی بولی کا وہ روپ ہے جس میں عربی فارسی الفاظ کسی قدر زیادہ اور تت سم سنسکرت الفاظ تقریباً نہیں کے برابر ہوتے ہیں لیکن اس خصوصیت کے باعث اردو کھڑی بولی سے علیحدہ زبان نہیں ہو جاتی۔" [۳۱]

ڈاکٹر شوکت سبزواری (۱۹۰۸ء - ۱۹۷۳ء) نے اپنی تصنیف داستانِ زبانِ اردو (دہلی، ۱۹۶۱ء) میں اردو کے آغاز و ارتقا، اس کے آغاز کے مختلف نظریوں اور اس کے مولد و منشا سے بڑی مدلل اور تفصیلی بحث کی ہے، اس کے بعد اردو کے آغاز سے متعلق اپنا ایک الگ نظریہ پیش کیا ہے جس کے مطابق اردو کھڑی بولی سے ترقی پا کر بنی ہے جو دہلی اور میرٹھ کے نواح میں گیارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ وہ کھڑی بولی اور ہندستانی کو ایک ہی زبان تصور کرتے ہیں اور اردو کو اس کی ادبی شکل مانتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ اردو، ہندستانی اور کھڑی بولی تینوں کو ایک ہی زبان تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا یہ بھی نظریہ ہے کہ کھڑی بولی یا ہندستانی یا دوسرے لفظوں میں اردو مسلمانوں کی آمد سے پہلے دہلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

" اردو ہندستانی سے ترقی پا کر بنی جو دہلی، میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ جب مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے تو ہندستانی، دہلی کے بازاروں میں بول چال کی حیثیت سے رائج تھی۔ امیر خسرو، ابوالفضل، شیخ بہاء الدین باجن نے اسے دہلوی کہا۔ ہندو اہلِ علم عام طور سے برج، قنوجی، بندیلی وغیرہ بولیوں سے امتیاز کے لیے جو اس وقت "پڑی" کہلاتی تھیں، کھڑی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جب یہ زبان ترقی پا کر آگے بڑھی، مسلمانوں کی سرپرستی میں پروان چڑھی، ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا

تو ہندُستانی کہلائی۔ زبان بنیادی طور سے وہی رہی جو آج ہے۔ اس کے نام ایک سے زیادہ تجویز ہوئے"۔ ۳۲

وہ مزید لکھتے ہیں:

"ہندُستانی کے مولد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ سب متفقہ طور سے اسے دہلی اور میرٹھ کی زبان بتاتے ہیں۔ اردو اس کی ادبی شکل ہے۔ اس زبان کو یہ نام بعد میں دیا گیا جب مسلمانوں کی سرپرستی میں بول چال کی زبان سے ترقی کر کے اس نے ادب و شعر کی زبان کا درجہ پایا"۔ ۳۳

"اردو کھڑی بولی سے ترقی پاکر بنی جس کی بابت عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ دہلی اور میرٹھ کے نواح میں بولی جاتی تھی"۔ ۳۴

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری مغربی ہندی (جس کی پانچ بولیاں: برج بھاشا، بندیلی، قنوجی، کھڑی بولی اور ہریانی ہیں) کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ اسے وہ ایک طرح کی "ذہنی تجرید" یا "منطقی اُپج" بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک مغربی ہندی ایک طرح کی فرضی اور خیالی زبان ہے۔ وہ مغربی ہندی کو درمیان سے نکال کر اردو اور پراکرت کی درمیانی کڑی اپ بھرنش کو مانتے ہیں اور اردو کا ارتقا اپ بھرنش سے دکھلاتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ ایک بول چال کی اپ بھرنش تھی جو دہلی اور میرٹھ میں گیارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی، اور یہی اردو کا ماخذ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اردو اور پراکرت کی درمیانی کڑی اپ بھرنش ہے۔ اس لیے مغربی ہندی کو درمیان سے نکال کر یہ کہنا کہ اردو اپ بھرنش سے ارتقا پاکر وجود میں آئی زیادہ صحیح ہے"۔ ۳۵

وہ مزید لکھتے ہیں:

"اردو یا ہندستانی اپ بھرنش کے اس روپ سے ماخوذ ہے جو گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں مدھیہ دیش میں رائج تھی۔ مغربی اپ بھرنش اس کی ادبی شکل ہے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ بول چال کی اپ بھرنش سے مختلف ہے ...... یہ بول چال کی اپ بھرنش دہلی اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی۔"[۳۶]

اپ بھرنش کے ساتھ ڈاکٹر شوکت سبزواری قدیم مغربی ہندی کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اُسے اردو کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"گیارہویں صدی عیسوی یا اس سے کچھ پہلے اُردو کے خط و خال اُبھرے یا یوں کہیئے اردو نے قدیم مغربی ہندی سے ترقی پاکر موجودہ روپ اختیار کیا۔"[۳۷]

لیکن آگے چل کر وہ خود اس کی تردید بھی کرتے ہیں:

"راسو کی زبان قدیم برج ہے یا خود ساختہ مخلوط ادبی زبان۔ قدیم مغربی ہندی ہرگز نہیں جسے اردو یا ہندستانی کی اصل بتایا جاتا ہے۔ جب تک مغربی ہندی کا اصل روپ سامنے نہ ہو، اس کے خط و خال متعین نہ ہوں، اس کی لسانی خصوصیات کی نشان دہی نہ کی جائے، ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ گیارہویں صدی عیسوی میں مغربی ہندی دہلی اور میرٹھ کے نواح میں بولی جاتی تھی اور اردو اس سے ترقی پاکر بنی۔ میرے خیال میں قدیم مغربی ہندی کا تصور جیسا کہ میں اپنے تحقیقی مقالے میں عرض کر چکا ہوں ایک طرح کی ذہنی تجرید یا منطقی اُپج ہے۔"[۳۸]

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو اور کھڑی بولی کے متعلق جو باتیں کہی ہیں ان میں کچھ وزن ہے، لیکن اپ بھرنش، قدیم مغربی ہندی اور ہندستانی وغیرہ سے متعلق ان کی بہت سی باتیں کافی گنجلک اور مبہم ہیں اور ان میں بے حد تضاد پایا جاتا ہے۔ کبھی وہ اردو کا ارتقا براہِ راست کھڑی بولی اور ہندستانی سے دکھلاتے ہیں تو کبھی بول

---

[۳۷] "اُردو زبان کا ارتقا"، باب سوم۔

چال کی اپ بھرنش اور قدیم مغربی ہندی سے، کبھی وہ اردو اور ہندستانی کو ایک مانتے ہیں تو کبھی اردو کو ہندستانی کی ادبی شکل تسلیم کرتے ہیں۔

اردو اور کھڑی بولی کے متعلق پاکستان کے ڈاکٹر سہیل بخاری کا بھی تقریباً وہی نقطہ نظر ہے جو شوکت سبزواری کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دراصل اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں جسے ماہرین علم زبان نے کھڑی بولی کا نام دیا ہے۔ ان کے موجودہ رویوں میں دو فرق واضح ہیں، ایک لپی اور دوسرا دخیل الفاظ ..... علم زبان کے لحاظ سے دونوں کے یہ اختلافات قابلِ التفات نہیں کیونکہ ان سے زبان کی بنیادی خصوصیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا..... کھڑی بولی کی قدیم تاریخ اردو زبان کا بھی ایسا ہی اہم حصہ ہے جیسا ہندی کا۔" ۳۹

پروفیسر گیان چند جین ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں ڈھونڈنا چاہیے، اول کھڑی بولی کا آغاز، دوسرے کھڑی بولی میں عربی فارسی لفظوں کا شمول، جس کا نام اردو ہو جاتا ہے۔ میرامّن سے لے کر ڈاکٹر مسعود حسین خاں تک نے دوسری منزل کے بارے میں بات کی ہے، جب کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری نے پہلی منزل پر زور دیا ہے۔" ۴۰

ڈاکٹر سہیل بخاری کے جس نظریے کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے وہ اردو کے بارے میں ان کا قدیم نظریہ ہے جسے انھوں نے تقریباً بیس سال قبل اپنے ایک مضمون "اردو کا قدیم ترین ادب" مشمولہ نقوش (مئی ۱۹۶۵ء) میں پیش کیا تھا، لیکن اب ان کے اس نظریے میں بہت بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ چند سال ہوئے پاکستان میں

ان کی ایک کتاب اردو کے روپ شائع ہوئی ہے جس میں انھوں نے اردو کے ماخذ اور اس کی ابتدا اور نشو و نما کے تمام مسلمہ اصول و نظریات اور حقائق کو باطل قرار دے کر ایک بالکل نئے اور انوکھے نظریے کی تشکیل کی ہے جسے عقلِ سلیم بھی تسلیم نہیں کر سکتی۔

پاکستان کے جناب فتح محمد ملک اپنی کتاب اندازِ نظر (لاہور، ۱۹۸۰ء) کے ایک مضمون "لسانی تحقیق کا سیاسی پہلو" میں اردو کے روپ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر بخاری کی تحقیق کی رو سے اردو نہ تو پنجاب میں پیدا ہوئی، نہ سندھ میں، نہ دکن میں، نہ دلّی میں، بلکہ اردو کی جنم بھومی اڑیسہ ہے۔ اردو ہند آریائی زبان نہیں۔" [۱۴]

آگے چل کر انھوں نے ڈاکٹر سہیل بخاری کی مذکورہ کتاب کی یہ عبارت نقل کی ہے جو اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں ان کے جدید نظریے کا عکس پیش کرتی ہے۔

"سنسکرت سے الگ تھلگ اور آزاد، ٹھیٹھ ہندوستانی یا دراوڑی بولی ہے جو جنم جنم سے اس دیس میں بولی جارہی ہے۔ اردو ہی نہیں ہندوستان کی سبھی بولیاں آریوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے بھی بولی جاتی تھیں۔ آریوں کے آتے وقت بھی بولی جاتی تھیں اور جب سے اب تک برابر بولی جارہی ہیں، اور ان کی آوازوں، اصولوں اور ڈھانچوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی لپیاں بدلتی رہی ہوں۔" [۱۵]

اس قسم کے مفروضات و نظریات کو کسی علمی بحث کا موضوع نہیں بنایا جاسکتا انھیں محض 'ایجادِ بندہ' ہی کہا جاسکتا ہے۔

اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کے متضاد نظریات کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ انھوں نے لسانیات سے متعلق اپنی پہلی تحقیقی تصنیف اردو زبان کا ارتقا (ڈھاکہ، ۱۹۵۶ء) میں اردو کے آغاز کا ایک اور نظریہ پیش کیا تھا جو اردو کے پالی زبان کے ساتھ رشتے سے متعلق ہے۔ اس نظریے کے مطابق اردو کی اصل قدیم پراکرت قرار پاتی ہے جو اردو زبان کی تاریخ کو کئی سو سال پیچھے ماضی کے دھندلکے میں لے جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اردو، ہندستانی یا کھڑی، قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہیے کہ ادلتے بدلتے پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ اُن سے لیتے، اِس حالت کو پہنچی جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ پالی اس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے۔ اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔ پالی، ادب، فنون اور فلسفہ کی زبان ہے اور ہندوستانی، روزانہ بول چال، لین دین اور کاروبار کی۔ پالی ادبی درجے کو پاکر ٹھہر گئی، لیکن ہندوستانی عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے اور بازار ہاٹ میں بولے جانے کے باعث ترشتی ترشاتی اور پھلتی پھلاتی رہی۔"[۴۳]

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ پالی کو اردو زبان کی اصل قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر سید احتشام حسین (۱۹۱۲-۱۹۷۲ء) نے ہندستانی لسانیات کا خاکہ کے مقدمے میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے "یہ خیال پیش کیا ہے کہ اردو کی ابتدا کا سراغ پالی میں تلاش کرنا چاہیے"[۴۴] حالاں کہ یہ بات نہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نہ تو پالی کو اردو کا ماخذ تسلیم کرتے ہیں اور نہ اردو کی ابتدا کا سراغ پالی میں تلاش کرتے ہیں۔ انھی کی تردید انھوں نے داستانِ زبانِ اردو

(دہلی، ۱۹۶۱ء) کے "پیش لفظ" میں خود ہی کردی ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ وہ پالی اور اردو میں بعض لسانی مماثلتوں کی بنا پر ان دونوں زبانوں کے تعلق اور رشتے پر زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے سید محی الدین قادری زور (۱۹۰۵-۱۹۶۲ء) پالی زبان کے ساتھ اردو کے تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "پالی بھی اردو کی طرح تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی اور ان دونوں میں ایک ایسی مشابہت نظر آتی ہے جس کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔"[۳۳]

۷

اُردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ ایک خالص لسانیاتی مسئلہ ہے جو لوگ لسانیات سے کماحقہ، واقفیت نہیں رکھتے، نیز ہند آریائی زبانوں کے تاریخی ارتقا ان کے صرفی و نحوی اصولوں اور صوتی تبدیلیوں پر نظر نہیں رکھتے وہ جب اس مسئلے پر غور کرتے ہیں تو محض قیاس آرائی سے کام لیتے ہیں اور بالعموم دو غلط فہمیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ پہلی غلط فہمی کے نتیجے میں وہ اردو کو ایک "کھچڑی" یا ملواں زبان قرار دیتے ہیں، یعنی ایک ایسی زبان جو مختلف زبانوں کے الفاظ کے اختلاط و آمیزش کے نتیجے میں وجود میں آئی ہو۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جب دو زبانیں آپس میں ملتی ہیں یا ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو ایک تیسری زبان معرضِ وجود میں آجاتی ہے۔ ان کے نزدیک اردو زبان کی تشکیل بھی اسی عمل کا نتیجہ ہے۔ کیوں کہ اس میں مسلمانوں کے لائے ہوئے عربی فارسی الفاظ اور ہندی (ہندی الاصل) الفاظ کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ امام بخش صہبائی نے کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> "شاہ جہاں آباد تیموریہ خاندان کے شاہ جہاں نے آباد کیا۔ اس وقت فارسی کے بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر الفاظ میں کثرتِ استعمال کے سبب تغیر

واقع ہوا اور اس خلا ملا سے جو بولی مروّج ہوئی اس کا نام اردو ٹھہرا۔"[۴۶]

اس قسم کے نظریات رکھنے والے اہلِ علم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر زبان کی اپنی ایک اصل ہوتی ہے جس سے وہ زبان تشکیل پاتی ہے، ایک اساس ہوتی ہے جس سے اس زبان کا ارتقا عمل میں آتا ہے، ایک بنیاد ہوتی ہے جس پر اس زبان کا ڈھانچا تیار ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر ایک مخصوص و ممیّز زبان ہوتی ہے جس سے ترقی پاکر وہ زبان وجود میں آتی ہے۔ محض دو زبانوں کا باہم اختلاط یا 'خلا ملا' ایک نئی زبان کو جنم دینے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ پجن ( PIDGIN ) اور کری اول ( CREOLE ) زبانوں کا معاملہ اور ہے۔ اردو نہ تو پجن زبان ہے اور نہ ہی کری اول۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کی تہ میں جو زبان یا بولی موجود ہے اس کا پتا لگانے کی پوری کوشش کی گئی ہے اور حافظ محمود خاں شیرانی، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور بہت سے دوسرے ہندوستانی اور غیر ملکی علما نے اپنے اپنے طور پر اس کا پتا لگا لیا ہے، لیکن میر امّن سے لے کر اب تک بہت سے عالم جن میں کئی مغربی عالم بھی شامل ہیں اردو کو ایک 'ملواں' اور 'مخلوط' زبان ہی تصوّر کرتے رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ایک زندہ زبان کی حیثیت سے اردو نے ہر دور میں دوسری زبانوں سے اخذ و استفادہ کیا ہے۔ آج اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں، لیکن اردو کا بنیادی ڈھانچا یا کینڈا اسی قدیم زبان پر قائم ہے جو اس کی اصل و اساس ہے۔ لسانیات کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ زبان اپنی اصل، اپنی ساخت و بنیاد نیز اپنے اصول و قواعد سے پہچانی جاتی ہے نہ کہ اپنے سرمایۂ الفاظ (بالخصوص مفرد الفاظ) سے۔ کسی زبان میں غیر زبانوں کے الفاظ کی موجودگی سے اس زبان کے بنیادی ڈھانچے میں کسی قسم کا فرق نہیں

پیدا ہوتا۔ فرہنگِ آصفیہ (۱۸۹۲ء) میں تمام مندرج الفاظ کی تعداد ۵۴۰۰۹ بتائی گئی ہے۔ ان میں عربی کے ۷۵۸۴ اور فارسی کے ۶۰۴۱ الفاظ شامل ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ۱۳۶۲۵ ہے اور ان کا تناسب ۲۳ فی صد ہے۔ اگر اردو میں ۹۰ یا ۹۵ فی صد الفاظ عربی اور فارسی زبانوں کے پائے جاتے تب بھی یہ زبان سامی یا ایرانی نہ کہلاتی، بلکہ ہند آریائی ہی رہتی، کیوں کہ اردو زبان کے اصلی یا بنیادی سرمایے یا اس کے ترکیبی اجزا، جن سے اس زبان کی تعمیر و تشکیل ہوئی ہے، کا تعلق ہند آریائی سے ہے، نیز وہ قدیم زبان جس سے اردو نے ارتقا پایا ہے، ہند آریائی ہے۔

اردو کی اصل و اساس، اس کے ترکیبی اجزا، نیز اس کے بنیادی ڈھانچے یا کینڈے کو نظر انداز کر کے محض اس کے سرمایۂ الفاظ پر نظر رکھتے ہوئے اردو کو ایک 'کھچڑی' زبان سمجھنا ایک گمراہ کن نظریہ ہے، لیکن اردو کی پیدایش کا مسلمانوں کو ذمے دار ٹھہرانا اس سے بھی زیادہ گمراہ کن تصور ہے۔ یہ دوسری غلط فہمی ہے جس کے نتیجے میں اردو کے آغاز کو مسلمانوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اردو کو سندھ سے منسوب کیا گیا کیوں کہ مسلمان پہلے پہل سندھ میں آئے تھے۔ اردو کو پنجاب سے منسوب کیا گیا کیوں کہ دہلی آنے سے قبل مسلمانوں نے تقریباً دو سو سال تک پنجاب میں قیام کیا تھا۔ اردو کو دکن سے منسوب کیا گیا کیوں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ سب سے پہلے سواحلِ دکن ہی سے شروع ہوا تھا۔ اگر اردو اور مسلمانوں کا اتنا ہی قریبی رشتہ ہوتا کہ جہاں جہاں مسلمان جاتے اردو کی پیدایش کے ذمے دار قرار پاتے تو آج ان ممالک کی زبان بھی اردو ہی ہوتی، جہاں مسلمان فاتح کی حیثیت سے گئے اور جہاں آج ان کی اکثریت ہے۔ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو اردو کی پیدایش کے اصل ذمے دار ہندو ہیں، نہ

کر مسلمان۔ مولوی عبدالحق (۱۸۶۹ - ۱۹۶۱ء) نے اپنے ایک صدارتی خطبے میں اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ یہ بدیسی زبان ہے یا مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہ سراسر غلط اور لغو ہے اور جان بوجھ کر آنکھوں میں خاک ڈالنی ہے۔ مسلمان اسے کہاں سے لائے تھے۔ یہ خاص ہندوستان کی پیداوار ہے اور دونوں قوموں یعنی ہندو مسلمانوں کے لسانی، تہذیبی اور معاشرتی اتحاد کا نتیجہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بنانے والے زیادہ تر ہندو ہیں"۔ ؎۳۵

اردو کے آغاز و ارتقا پر غور کرتے وقت جس طرح ہم دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے، اسی طرح ان بولیوں کے بولنے والوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مقامی بولیاں بولنے والوں میں تقریباً سب ہی ہندو تھے جو محکوم اور مفتوح تھے۔ فاتح قوم کی زبان فارسی تھی۔ تعلیم گاہوں اور مدرسوں، درباروں اور دفتروں، امیروں اور وزیروں حتیٰ کہ بادشاہوں تک رسائی کا بڑا ذریعہ یہی زبان تھی۔ سیاسی و سماجی مفادات، نیز مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر ہندوؤں کے لیے فاتح اور حکمراں قوم کی زبان سیکھنا اور اس میں درک پیدا کرنا لازمی تھا۔ چنانچہ ہندوؤں نے حکمراں طبقے کے روبرو سرخرو ہونے اور سلطنت میں اعلا مراتب و مناصب حاصل کرنے کے لیے فارسی سیکھی جو پورے مسلم دورِ حکومت میں دفتری و درباری زبان ہونے کے علاوہ تصنیف و تالیف، ادب و شعر، تہذیب و ثقافت اور درس و تدریس کی بھی زبان تھی۔ مسلمان تو فاتح تھے وہ کیوں یہاں کی زبانیں سیکھتے۔ انھوں نے اپنے محکوموں کی زبان سیکھنا اور اس میں گفتگو کرنا کچھ دنوں تک ضرور کسرِ شان سمجھا ہوگا۔ لہٰذا جیسا کہ ہوتا آیا ہے کہ محکوموں ہی کو حاکموں کی زبان سیکھنا پڑتی ہے، ہندوؤں نے بھی فارسی سیکھی، اور بقول

مولوی عبدالحق:

"ہندوؤں نے تو اس کے حاصل کرنے میں بڑا کمال دکھایا۔ ان میں فارسی کے ایسے فاضل ادیب اور شاعر گزرے ہیں کہ ان کی بعض تصانیف اب تک مستند سمجھی جاتی ہیں اور مدتوں داخلِ نصاب رہیں۔ متواتر مطالعہ، مشقِ شعر و سخن، روزمرّہ کی نوشت و خواند، صحبتِ اہلِ علم، نیز اس وقت کے ماحول اور رواج کی وجہ سے فارسی ان کے دل و دماغ میں رچ گئی تھی اور تقریباً ان کی اپنی زبان ہو گئی تھی۔" ۴۹

چوں کہ وہ فارسی سیکھ چکے تھے اس لیے اپنی روز مرّہ کی بول چال کی زبان میں بھی وہ فارسی الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرنے لگے۔ اس طبقے کے زیرِ اثر اور حکمراں طبقے کے ساتھ میل جول کے باعث عوام کی زبان میں بھی عربی فارسی الفاظ شامل ہونا شروع ہو گئے۔ مقامی زبانوں کے شعرا بھی عربی فارسی الفاظ کے استعمال سے نہ بچ سکے۔ چناں چہ پرتھوی راج راسو کی زبان اور کبیر داس (۱۳۹۸ - ۱۵۱۸ء) سورداس (۱۴۷۸ - ۱۵۸۳ء) اور تلسی داس (۱۵۲۳ - ۱۶۲۳ء) کی شاعری میں عربی فارسی الفاظ کا آزادانہ استعمال پایا جاتا ہے۔ اس طرح ہندوؤں میں بولی جانے والی ایک مخصوص زبان یا بولی جو ایک مخصوص عہد میں مغربی یوپی، دہلی اور اس کے نواح میں ابھر کر سامنے آئی تھی عربی فارسی الفاظ کی شمولیت سے نکھرنے لگی۔ اسی زبان کا "ابھار" اور "نکھار" اردو کا ابھار اور نکھار قرار پایا۔ شروع شروع میں یہ زبان اپنی اسی مقامی خصوصیت کے باعث ہندوئی، ہندوی اور ہندی کہلائی۔ اس وقت اس کے بولنے والوں میں تقریباً سب ہی مقامی باشندے تھے اور اس طرح تقریباً سب ہی ہندو تھے، اور بہ قول مولوی عبدالحق اس زبان میں انھیں لوگوں نے "بے دھڑک" فارسی لفظ

داخل کرنے شروع کر دیے تھے یہی زبان مسلمان صوفیوں نے بھی سیکھی اور
دین کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ انھیں صوفیوں اور بزرگوں کی مساعی سے
جب یہاں اسلام پھیلا تو ان میں سے بہتوں نے اسلام قبول کر لیا، لیکن ان
کی زبان وہی رہی جسے وہ شروع سے بولتے آئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ وقت کے
ساتھ ساتھ اس میں فطری لسانی تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں جو ہر زندہ زبان میں
ہوتی ہیں۔ صوفیائے کرام سے قطع نظر اس زبان کے بولنے والوں کے دو بڑے طبقے
ابھر کر سامنے آچکے تھے۔ ایک طبقہ ہندوؤں کا تھا جو اکثریتی طبقہ تھا اور دوسرا طبقہ
نومسلموں کا تھا۔ آگے چل کر حکمراں طبقے کو بھی یہی زبان اختیار کرنی پڑی جسے
اس نے کبھی منہ نہیں لگایا تھا اور نہ ہی قابلِ اعتنا سمجھا تھا۔

تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ فاتح کی حیثیت سے جو مسلمان باہر
سے آئے تھے ان کی تعداد کوئی بہت زیادہ نہیں تھی۔ فوج کشی اور ملک گیری
کے بعد ان میں سے کچھ تو اپنے وطن واپس چلے گئے اور جو نہیں جا سکے انھوں نے
یہیں کی بود و باش اختیار کر لی۔ یہیں کے لوگوں میں رہ کر شادی بیاہ کی رسمیں
انجام دیں، یہیں کے سرد و گرم کا مقابلہ کیا، یہیں کے حالات و واقعات سے
دوچار ہوئے اور یہیں جیے اور یہیں مرے اور نسلاً بعد نسلٍ اپنے آبا کی ہر چیز سے
دور اور یہاں کی ہر چیز سے قریب تر ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ زبان، نسل، رنگ
اور مزاج کے اعتبار سے بھی وہ اپنے آبا سے بالکل مختلف ہو گئے۔ انھوں نے پہلے
تو اپنی مادری زبان ترکی کی پھر فارسی کو خیرباد کہا اور آخر میں ایک ایسی "گری پڑی" زبان
اختیار کر لی جس میں گفتگو کرنا ان کے آبا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ یہ گری پڑی زبان
انھیں مقامی ہندوؤں اور نومسلموں کی زبان تھی۔ جسے صوفیہ نے تبلیغ و اشاعت
دین کا ذریعہ بنایا تھا اور جس میں کافی حد تک عربی فارسی الفاظ داخل ہو چکے تھے

یہ زبان حاکموں کے لیے اب اجنبی نہیں رہ گئی تھی، پھر فارسی کے زوال نے انھیں اس زبان کو اختیار کرنے پر اور بھی زیادہ مجبور کر دیا تھا۔

بابر (وفات ۱۵۳۰ء) جس نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی، ترکی زبان کا ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ اس نے اپنی خود نوشت سوانح عمری تزکِ بابری (بابر نامہ) ترکی زبان میں تصنیف کی تھی لیکن محض سو سال کے اندر اس کے پوتے اکبر (وفات ۱۶۰۵ء) اور پڑپوتے جہاں گیر (وفات ۱۶۲۷ء) کے لیے یہ ایک اجنبی زبان بن چکی تھی۔ اسی لیے اکبر کو تزکِ بابری کا ترجمہ کروانا پڑا۔ اکبر کے حکم کی تعمیل میں عبدالرحیم خان خاناں (۱۵۵۳ - ۱۶۲۶ء) نے تزکِ بابری کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔[۵]

یہ حقیقت ہے کہ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد سے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ فارسی بھی روبہ زوال ہونے لگتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی اردو کے عروج کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بڑی آزمائش و ابتلا اور سیاسی انتشار اور الٹ پھیر کا دور ہوتا ہے اسی پُر آشوب دور میں اردو پروان چڑھتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دلّی کے گلی کوچوں اور بازاروں میں ماری ماری پھرنے والی اردو کی یہ 'چھوکری' اب اس لائق سمجھی جانے لگی ہے کہ اسے مُنہ لگایا جا سکے۔ یہیں سے اردو شاعری کی باقاعدہ داغ بیل پڑتی ہے۔ مشاعروں اور مراختوں کا آغاز ہوتا ہے اور فارسی گو شعرا فارسی چھوڑ چھوڑ کر اردو میں شعر کہنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ مشہور مورخ ڈاکٹر تارا چند (۱۸۸۸ - ۱۹۷۳ء) نے اپنی کتاب انفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر میں اس صورتِ حال کی بڑی حقیقت پسندانہ عکاسی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک سانی امتزاج وجود میں آیا مسلمانوں نے اپنی ترکی اور فارسی ترک کر دی اور ہندوؤں کی زبان اختیار کر لی"۵۲

ظاہر ہے کہ اس وقت ہندوؤں کی زبان کیا تھی، یہی 'اردو' جس کا پرانا نام ہندوی' اور 'ہندی' تھا۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو کے آغاز و ارتقا کا سہرا صحیح معنوں میں ہندوؤں ہی کے سر ہے اور وہی اس کی پیدائش کے حقیقی ذمے دار ہیں۔ مسلمانوں کو اردو کی پیدائش کا ذمے دار قرار دینا یا اردو کو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ منسوب کرنا تاریخی اور لسانی حقائق کو جھٹلانا ہے۔ ہاں اس بات سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں نے اردو کو نکھارنے اور چمکانے، سجانے اور سنوارنے، نیز اسے ترقی یافتہ بنانے اور ادبی وعلمی مرتبے تک پہنچانے میں ایک نمایاں اور اہم بالشان کردار ادا کیا ہے، اور آج یہ برِ صغیرِ ہندو پاک کے کروروں مسلمانوں کی اپنی زبان بن چکی ہے۔

## حواشی

۱۔ سنیتی کمار چیٹرجی، انڈو آرین اینڈ ہندی (کلکتہ: فرما کے۔ ایل۔ مکھوپادھیائے، ۱۹۶۹ء) ص ۱۰۴ [طبعِ اوّل، ۱۹۴۲ء] چیٹرجی نے اس کتاب کے صفحہ ۱۰۳ پر بھی تقریباً یہی خیال پیش کیا ہے۔

۲۔ سید سلیمان ندوی، نقوشِ سلیمانی (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین، ۱۹۳۹ء)، ص ۳۱۔ یہ اُردو زبان کے آغاز کا کوئی نظریہ نہیں بلکہ محض قیاس آرائی ہے۔

۳۔ امیر سبکتگین غزنی کے ترک بادشاہ الپتگین کا داماد تھا۔ وہ الپتگین کی وفات (۹۷۷ء) کے بعد اس کا جانشین مقرر ہوا اور بیس سال (۹۷۷ء تا ۹۹۷ء) تک حکومت کی۔ تو رفیعنا

کا خیال ہے کہ ۹۹۷ء میں جب سبکتگین کا انتقال ہوا تو اس وقت پورا پنجاب اس کے زیر نگیں تھا۔

۴۔ یمین الدولہ محمود۔

۵۔ حافظ محمود خاں شیرانی۔ پنجاب میں اردو (لکھنؤ: نسیم بکڈپو، ۱۹۷۰ء)، ص ۱۹۔ [طبع اوّل ۱۹۲۸ء]

۶۔ ایضاً، ص ۹۹۔

۷۔ دیکھیے مسعود حسین خاں، "پیش لفظ" مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو۔

۸۔ بہ حوالہ مسعود حسین خاں، "دکنی یا اردوئے قدیم؟" مشمولہ شعر و زبان (حیدرآباد، ۱۹۶۶ء) ص ۱۷۱۔۱۷۴۔

۹۔ سید محی الدین قادری زورؔ، "اردو کی ابتدا"، مشمولہ اردو لسانیات، مرتبہ فضل الحق (دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۸۱ء)، ص ۴۱ [اشاعتِ اوّل ۱۹۶۲ء]۔ یہ کتاب دراصل شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے علمی و تحقیقی مجلے اُردوئے معلّٰی کا 'اردو لسانیات نمبر' ہے۔

۱۰۔ سید محی الدین قادری زورؔ، ہندستانی لسانیات (لکھنؤ: نسیم بکڈپو، ۱۹۶۰ء)، ص ۹۴۔۹۵ [طبع اوّل ۱۹۳۲ء]

۱۱۔ ٹی۔ گراہم بیلی، جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی (۱۹۳۰ء)، ص ۳۹۱۔ بہ حوالہ شوکت سبزواری، داستانِ زبانِ اردو (دہلی: چمن بکڈپو، س ن)، ص ۵۰۔

۱۲۔ ٹی۔ گراہم بیلی، اے ہسٹری آف دی اردو لٹریچر (لندن، ۱۹۳۲ء) بہ حوالہ مسعود حسین خاں، "اردو زبان کی ابتدا و ارتقا کا مسئلہ" مشمولہ فکر و نظر (علی گڑھ)، جلد ۹، شمارہ ۳۵ (۱۹۶۹ء)، ص ۱۴۔

۱۳۔ مسعود حسین خاں، مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو (علی گڑھ، سرسیّد بکڈپو، ۱۹۷۰ء)، ص ۱۴۲۔ [طبع اوّل ۱۹۴۸ء]

۱۴ ۔ ایضاً، ص ۱۹۳۔

۱۵ ۔ ایضاً۔

۱۶ ۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔

۱۷ ۔ ایضاً، ص ۲۶۴۔

۱۸ ۔ ژول بلاک، بلیٹین آف دی اسکول آف اورینٹل سٹڈیز جلد ۵، ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۰ء۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۲۴۲۔

۱۹ ۔ سید محی الدین قادری زور، تصنیفِ مذکورہ، ص ۹۵ ۔ ۹۶۔

۲۰ ۔ سید محی الدین قادری زور، "اردو کی ابتدا" مشمولہ اردو لسانیات، مرتبہ فضل الحق (دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۸۰ء)، ص ۵۵۔ [طبع اوّل ۱۹۶۲ء]

۲۱ ۔ دیکھیے گیان چند جین۔ "اردو کے آغاز کے نظریے"، مشمولہ ہندوستانی زبان (بمبئی)۔ نمبر ۳ ۔ ۴ (جولائی تا اکتوبر ۱۹۷۷ء)۔

۲۲ ۔ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو۔ بہ حوالہ کے۔ ایس بیدی، تین ہندوستانی زبانیں (دہلی: کتب خانہ انجمن ترقیِ اردو، جامع مسجد، ۱۹۶۶ء)، ص ۱۷۹۔ [طبع اوّل ۱۹۶۱ء]

۲۳ ۔ آمنہ خاتون، دکنی کی ابتدا (بنگلور، ۱۹۷۰ء)، ص ۳۴۔

۲۴ ۔ ایضاً، ص ۱۵۔

۲۵ ۔ محمد حسین آزاد، آبِ حیات (کلکتہ: عثمانیہ بک ڈپو، ۱۹۶۷ء) ص ۱۳۔ [طبع اوّل ۱۸۸۰ء]

۲۶ ۔ روڈولف ہیور نلے، "مقدمہ" گوڑی زبانوں کی قواعد، ص ۶ ۔ ۷ ۔ بہ حوالہ شوکت سبزواری، داستانِ زبانِ اردو (دہلی: چمن بک ڈپو، س،ن)، ص ۸۴۔

۲۷ ۔ سید شمس اللہ قادری، تاریخ اردو۔ بہ حوالہ حافظ محمود خاں شیرانی، پنجاب میں اردو (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۷۰ء)، ص ۵۵۔

۲۸ - صاحب مفتاح التواریخ کے قول کے مطابق آگرہ سنہ ۹۰۹ھ مطابق ۱۵۰۲ء میں لودھی سلطنت کا دارالحکومت قرار پایا۔ بحوالہ محمد ولی الحق انصاری، "شمالی ہند کا ایک علمی و ادبی مرکز ۔ اکبر آباد (آگرہ)"، مشمولہ فکر و نظر (علی گڑھ)، جلد ۶، شمارہ ۲ (اپریل ۱۹۶۵ء)، ص ۱۷۔

۲۹ - مسعود حسین خاں، "اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ"، مشمولہ فکر و نظر (علی گڑھ)، جلد ۹، شمارہ ۳ (۱۹۶۹ء)، ص ۱۳۔

۳۰ - گیان چند جین، "اردو کے آغاز کے نظریے"، مشمولہ ہندوستانی زبان (بمبئی)، نمبر ۳۔۴ (جولائی تا اکتوبر ۱۹۷۷ء)، ص ۷۔

۳۱ - ایضاً، ص ۱۲۔

۳۲ - شوکت سبزواری، داستانِ زبانِ اردو (دہلی: چمن بکڈپو، س ن)، ص ۹۴۔ [طبع اوّل ۱۹۶۱ء]

۳۳ - ایضاً، ص ۹۵۔

۳۴ - ایضاً، ص ۹۹۔

۳۵ - ایضاً۔

۳۶ - ایضاً، ص ۱۰۳ - ۱۰۴۔

۳۷ - ایضاً، ص ۹۶۔

۳۸ - ایضاً، ص ۹۸۔

۳۹ - سہیل بخاری، "اردو کا قدیم ترین ادب"، مشمولہ نقوش، شمارہ ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء)، ص ۸۳۔ بحوالہ گیان چند جین، "اردو کے آغاز کے نظریے"، مشمولہ ہندوستانی زبان (بمبئی)، نمبر ۳۔۴ (جولائی تا اکتوبر ۱۹۷۷ء)، ص ۱۱۔

۴۰ - گیان چند جین، مضمون مذکورہ، ص ۱۴۔

۴۱۔ فتح محمد ملک، "لسانی تحقیق کا سیاسی پہلو"، اندازِ نظر (لاہور: التحریر، اردو بازار، کبیر اسٹریٹ، ۱۹۸۰ء)، ص ۱۴۴۔

۴۲۔ سہیل بخاری، اردو کے روپ۔ بہ حوالہ فتح محمد ملک، تصنیفِ مذکورہ ص ۱۴۴۔

۴۳۔ شوکت سبزواری، اردو زبان کا ارتقا (دہلی: چمن بکڈپو، س ن)، ص ۱۰۵ [طبع اوّل ۱۹۵۶ء]

۴۴۔ سیّد احتشام حسین، "مقدمہ" ہندوستانی لسانیات کا خاکہ (لکھنؤ: دانش محل، ۱۹۷۱ء)، ص ۵۷۔

۴۵۔ سیّد محی الدین قادری زورؔ، "اردو کی ابتدا" مشمولہ اردو لسانیات، مرتبہ فضل الحق (دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۸۱ء)، ص ۱۵۴۔ [طبع اوّل ۱۹۶۲ء]

۴۶۔ بہ حوالہ حافظ محمود خاں شیرانی، تصنیفِ مذکورہ، ص ۵۳۔

۴۷۔ بہ حوالہ سیّد وحید الدین سلیم، وضعِ اصطلاحات (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۰ء)، ص ۱۶۸، [طبع اوّل ۱۹۲۱ء]

۴۸۔ مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق، حصۂ دوم (دہلی: انجمن ترقیِ اردو (ہند)، ۱۹۴۴ء)، ص ۱۸۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۴۔

۵۰۔ ایضاً۔

۵۱۔ محمد ولی الحق انصاری، "شمالی ہندوستان کا ایک علمی و ادبی مرکز ـــ اکبر آباد (آگرہ)"، مشمولہ فکر و نظر (علی گڑھ) جلد ۶، نمبر ۲ (اپریل ۱۹۶۵ء)، ص ۹۱۔

۵۲۔ تاراچند، انفلوئنس آف اسلام اوّن انڈین کلچر، ص ۱۳۹۔ بہ حوالہ مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق، حصۂ دوم (دہلی: انجمن ترقیِ اردو (ہند)، ۱۹۴۴ء)، ص ۲۸۔

(۱۹۷۸ء، نظرِ ثانی ۱۹۸۴ء)

# اردو کا ادبی و لسانی ارتقا

## شمالی ہند میں

اُردو ایک ہند آریائی زبان ہے۔ شمالی ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں کے آغاز کا سلسلہ ۱۵۰۰ قبل مسیح میں آریوں کے داخلۂ ہند سے شروع ہوتا ہے۔ آریوں کی ہندوستان میں آمد کے سبب سب سے پہلے جس زبان کی نشو و نما ہوئی اسے 'ویدک سنسکرت' کہتے ہیں، جس کے قدیم ترین نمونے رگ وید میں ملتے ہیں۔ یہی زبان شستہ و شائستہ اور منضبط ہو کر 'کلاسیکی سنسکرت' کہلائی۔ جسے پاݨنی نے اپنی اَشٹا دھیائی کے ذریعے قواعد کے اصولوں میں جکڑ کر جامد بنا دیا۔ لگ بھگ ۶۰۰ قبل مسیح تک پہنچتے پہنچتے اس زبان نے جمود کا شکار ہو کر دم توڑ دیا۔ اس کی جگہ عوام نے ایک ایسی فطری زبان اختیار کر لی جو تلفظ کے اعتبار سے آسان اور قواعد کے لحاظ سے سادہ، اور ایک غیر مصنوعی زبان تھی، اس زبان کو علمائے لسانیات "پراکرت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

پراکرتوں کے ظہور کا زمانہ ۶۰۰ قبلِ مسیح ہے۔ پراکرتوں ہی کی کوکھ سے ۶۰۰ صدی عیسوی میں اپ بھرنشیں پیدا ہوئیں جو پورے چار سو سال تک پھلتی پھولتی رہیں۔ پراکرتوں کے اوّلین نمونے پالی اور اشوک کے کتبوں کی زبانیں ہیں۔ ان پراکرتوں نے جب ادبی روپ اختیار کر لیے تو عوامی زبان کے دھارے کا رُخ ایک بار پھر بدل گیا اور عوام ایک بار پھر سادہ و آسان زبان اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے جو پراکرت کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ یہی بگڑی ہوئی یا "بھرشٹ" زبان اپ بھرنش کہلائی۔ اس کی نشو و نما پورے شمالی ہندوستان میں ۶۰۰ء تا ۱۰۰۰ء ہوتی رہی۔ ۱۰۰۰ صدی عیسوی کے بعد اس کے ارتقا کی رفتار رک گئی اور مختلف اپ بھرنشوں سے مختلف جدید ہند آریائی زبانوں کے "اُبھار" کا زمانہ شروع ہوا۔ اردو کے اُبھار کا زمانہ بھی یہی ہے، اگرچہ اس کا باقاعدہ طور پر ارتقا ۱۱۹۳ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے، جو مسلمانوں کی فتح دہلی کی تاریخ ہے۔

اردو کی اصل شورسینی اپ بھرنش ہے جو شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی۔ شورسینی پراکرت کے حدودِ اربعہ وہی تھے جو قدیم ہند آریائی دور میں "مدھیہ دیش" یعنی وسطی ہند کے تھے اور جہاں سنسکرت پروان چڑھی تھی۔ غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو مدھیہ دیش کی اسی قدیم زبان کی آخری کڑی ہے۔

یہ خیال درست نہیں کہ اردو کی پیدائش کے اصل ذمّے دار مسلمان ہیں۔ اردو کی ابتدا یا اس کے آغاز کو جو ایک لسانی مظہر ہے، مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے منسوب کرنا گمراہ کن نظریہ ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اردو کا ابھار مسلمانوں کی دہلی میں آمد (۱۱۹۳ء) سے تقریباً دو سو سال قبل یعنی ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ شروع ہو چکا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ۱۱۹۳ء کے بعد سے اس کی ترقی کی رفتار تیز ہو گئی اور آہستہ آہستہ اس پر نکھار آنے لگا۔ شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد ایک

تاریخ ساز واقعہ ہے جس کے دور رس نتائج سے تقریباً سبھی زبانیں متاثر ہوئیں۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی (۱۸۹۰ - ۱۹۷۷ء) کا خیال ہے کہ اگر مسلمان شمالی ہندوستان میں نہ آتے تب بھی جدید ہند آریائی زبانوں کی پیدائش ہو جاتی، لیکن ان کے ادبی آغاز و ارتقا میں ضرور تاخیر ہو جاتی۔[1]

شورسینی اپ بھرنش کے چولا بدلنے کے بعد سے آہستہ آہستہ جس زبان کے خط و خال نمایاں ہونا شروع ہوئے اور جو زبان پورے دو سو سال تک شمالی ہند میں ابھرتی رہی وہ اردو ہی تھی جس کے باقاعدہ آغاز و ارتقا کی تاریخ ۱۱۹۳ء قرار پاتی ہے۔ سترھویں صدی کے مکمل ہونے تک اردو اپنے لسانی ارتقا کا ایک دور پورا کر لیتی ہے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی سے یہ اپنے ارتقا کے ایک دوسرے دور میں داخل ہوتی ہے، اور انیسویں صدی کے آغاز سے اس کا معیاری روپ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

۲
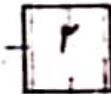
شمالی ہند میں گیارھویں اور بارھویں صدی کے دوران (۱۰۰۰ء تا ۱۱۹۳ء) ابھرنے والی زبان کو ہم 'پیش اردو' (PRE-URDU) کہیں گے۔ پیش اردو کی اصطلاح کو 'پروٹو اردو' (PROTO-URDU) کی اصطلاح کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ یہ دونوں اصطلاحیں دو الگ الگ لسانی ادوار کو متعین کرتی ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ 'پروٹو' (PROTO) سے زبان کی وہ حالت مراد ہے جو اس کے ضبطِ تحریر میں آنے سے قبل کی حالت تھی اور جسے بازتعمیر (RECONSTRUCT) کیا گیا ہو۔ بازتعمیری زبان کے تحریری نمونے دستیاب نہیں ہوتے۔ ایسی زبان کو مفروضہ (HYPOTHETICAL) زبان بھی کہتے ہیں۔ 'پیش' (PRE-) سے مراد زبان کے باقاعدہ آغاز سے پہلے کی شکل یا اس کے اوّلین و ابتدائی روپ سے ہے۔ اردو کا بالکل ابتدائی روپ ۱۰۰۰ء سے ۱۱۹۳ء تک کی زبان میں دیکھا جا سکتا ہے اور یہی

'پیش اردو' ہے۔[۲]

پیش اردو کا ڈھانچا یا کینڈا 'او ہٹھ' کی بنیادوں پر قائم ہے جو اپ بھرنش کے دورِ آخر کی یادگار ہے۔ یہ نہ تو برج بھاشا ہے، نہ کھڑی بولی ہے اور نہ ہی ہریانی ہے، کیوں کہ ان بولیوں کا وجود ہی اس وقت تک عمل میں نہیں آیا تھا۔ یہ اپ بھرنش کی ایک جدید تشکل (جسے قدیم ہندی کہہ سکتے ہیں) ہے جو بہ قولِ پروفیسر مسعود حسین خاں "یکساں طور پر ان بولیوں کے علاقوں میں ادبی اور معیاری زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔"[۳] اسی زبان کو ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی نے "ہندُستانی کا قریبی پیش رو" کہا ہے۔[۴]

چوں کہ پیش اردو کا ارتقا اپ بھرنش سے ہوا ہے اس لیے یہ لسانی اعتبار سے اپ بھرنش سے بہت زیادہ قریب ہے۔ پیش اردو میں تقریباً انھیں آوازوں کا استعمال ملتا ہے جو اپ بھرنش میں پائی جاتی ہیں، تاہم اس دور کی اردو میں چند نئی آوازوں کا ارتقا عمل میں آیا جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

- اپ بھرنش میں آٹھ مصوتے (VOWELS)، اَ (अ)، آ (आ)، اِ (इ)، ای (ई)، اُ (उ)، اوُ (ऊ)، اے (ए) اور او (ओ) پائے جاتے ہیں۔ پیش اردو میں دو نئے مصوتے اَے (ऐ) اور اَو (औ) وجود میں آئے۔ یہ دوہرے مصوتے (DIPHTHONGS) سنسکرت میں بھی پائے جاتے تھے، لیکن وسطی ہند آریائی دور کے ابتدا ہی میں متروک ہو گئے تھے۔ ان کی جگہ اے (ए) اور او (ओ) مصوتوں نے لے لی تھی۔
- اپ بھرنش میں /ڑ/ اور /ڑھ/ مصمتے نہیں پائے جاتے تھے۔ ان کا ارتقا پیش اردو میں ہوا۔
- پیش اردو میں /م/، /ن/ اور /ل/ کی ہکار شکلوں مھ، نھ اور لھ کا ارتقا

بھی عمل میں آیا، لیکن اردو میں ان کا استعمال صرف چند الفاظ ہی تک محدود رہا ہے۔

بیشتر اردو قواعد کے اعتبار سے بھی اپ بھرنش سے کافی قریب ہے۔ اس میں متعدد شکلیں ایسی تھیں جن کا تعلق اپ بھرنش سے تھا لیکن رفتہ رفتہ اپ بھرنش کی قواعدی شکلیں کم ہوتی گئیں اور اردو کی اپنی شکلیں ارتقا پانے لگیں جس سے اردو اپ بھرنش سے کافی حد تک ممیز ہوگئی۔ اس دور کی اردو میں قواعدی سطح پر جو تبدیلیاں واقع ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں:

- سنسکرت اور پراکرت کی طرح اپ بھرنش بھی کافی حد تک غیر تحلیلی (SYNTH-ETIC) زبان تھی۔ اس کی فعلی اور اسمی شکلیں غیر تحلیلی ہوتی تھیں، لیکن بیشتر اردو میں تحلیلی (ANALYTICAL) شکلیں عام ہوگئیں اور آہستہ آہستہ غیر تحلیلی شکلیں بالکل ہی ناپید ہوگئیں۔
- جنسِ مشترک (NEUTER GENDER) کا وجود کسی حد تک اپ بھرنش میں پایا جاتا تھا، لیکن سنسکرت اور پراکرت کے مقابلے میں زیادہ نہیں تھا۔ بیشتر اردو میں اس کا استعمال بالکل ہی ختم ہوگیا۔
- جملوں کی ساخت میں الفاظ کی ترتیب دھیرے دھیرے متعین ہونے لگی۔

جہاں تک ذخیرۂ الفاظ کا تعلق ہے، بالکل ابتدائی دور میں پراکرت اور اپ بھرنش ہی کے الفاظ اردو میں پائے جاتے تھے۔ کہیں کہیں تت سم الفاظ کا بھی میل نظر آجاتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ دوسری زبانوں اور بولیوں کے الفاظ بھی اردو میں داخل ہوتے گئے۔

## ۳

کسی قدیم زبان کی ساخت کی شناخت اور اس کے صرفی و نحوی اصولوں کے تعین کے لیے اس زبان کے لسانی سرمایے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ لسانی سرمایے کی مدد

سے اس زبان میں واقع ہونے والی تاریخی تبدیلیوں کا بھی پتا لگایا جا سکتا ہے۔
پیش اردو کا لسانی سرمایہ حسب ذیل ہے:

(۱) بُدھ سدّھوں، ناتھوں، جینیوں اور گورکھ پنتھی جوگیوں سے منسوب مذہبی تخلیقات: اگرچہ ان تخلیقات کی زبان کے بارے میں بہت کچھ شک و شبہ کی گنجایش موجود ہے تاہم ان کے مطالعے سے اس قدیم زبان کے بارے میں جو شمالی ہند میں اس زمانے میں رائج تھی، کافی حد تک معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔ یہ سدّھ اور جوگی لوگ پنجاب، گجرات اور برج کے علاقے سے لے کر بہار تک پھیلے ہوئے تھے، لہٰذا ان کی زبان پر مقامی بولیوں کے اثرات کافی حد تک نمایاں ہیں۔ ہندی کے عالم رام چندر شکل (۱۸۸۴ - ۱۹۴۱ء) نے ان لوگوں کی اس خلط ملط زبان کو "سَدھکڑی بھاشا" کے نام سے یاد کیا ہے۔

(۲) ہیم چندر کے پیش کردہ اپ بھرنش کے دورِ آخر کے نمونے: مشہور جین عالم ہیم چندر (۱۰۸۸ - ۱۱۷۲ء) نے اپنی قواعد ہیم چندر شبدانو شاسن میں مغربی اپ بھرنش کے آخری دور کے کچھ ادبی نمونے محفوظ کر دیے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس دور کی زبان کس حد تک اردو کے سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹرجی (۱۸۹۰ء - ۱۹۷۷ء) نے اپنی کتاب انڈو آرین اینڈ ہندی (۱۹۴۲ء) میں اس کے پانچ نمونے درج کیے ہیں جن میں سے ایک نمونہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

بَھلّا ہُوَا جُ مَارِیا، بَہِنی مَہارا کَنْتُ
لَجّے جَامُ تُ وَیَسِیاہُ جَیٔ بَھگّا گھرُ اَنْتُ

[= بھلا ہوا بہن جو میرا کنت (= پیارا، سوامی، شوہر) مارا گیا، جو بھاگا گھر آتا تو وایس پاؤں (= ہم عمر سہیلیوں) میں مجھے لاج آتی۔]

(۳) ڈنگل اور پنگل میں شاعری کے نمونے: اس دور میں زبان کے دو اور بھی

نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں، جنھیں 'ڈِنگل' اور 'پنگل' کہتے ہیں۔ ڈنگل راجستھانی کی ایک اہم بولی مارواڑی کی ادبی شکل ہے۔ اس کا استعمال درباری شاعری کے لیے کیا جاتا تھا۔ پنگل ایک ایسی ملی جلی زبان کی شکل تھی جس میں ابتدائی مغربی ہندی، شورسینی اپ بھرنش، راجستھانی بولیوں اور ابتدائی پنجابی زبان کی خصوصیات جابجا نظر آتی ہیں۔ راجپوتوں کی شاعری میں اس کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا۔ ڈنگل اور پنگل میں جو طویل رزمیہ نظمیں لکھی گئی ہیں اُنھیں "راسو" کہتے ہیں۔ ان کے مشہور شاعروں میں نرپتی نالا (مصنف بیسل دیو راسو)، چند بردائی (مصنف پرتھوی راج راسو)، سورج مل، ایسر داس، بنکی وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ پرتھوی راج راسو کی زبان کے متعلق کافی شک و شبہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ لسانی شواہد سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کم از کم اس نظم کے آخری حصّے یقیناً سولھویں صدی کے لکھے ہوئے ہیں، نہ کہ بارھویں صدی کے جب کہ اس کا مصنّف چند بردائی زندہ تھا۔

(۴) مسعود سعد سلمان کی شاعری: مسلمانوں میں مسعود سعد سلمان (وفات ۱۱۲۵ء اور ۱۱۳۰ء کے درمیان) پہلے مصنّف ہیں جنھوں نے عربی اور فارسی زبانوں میں لکھنے کے علاوہ بیش اردو میں بھی لکھا ہے۔ محمدؔ عوفی کے فارسی تذکرے لباب الالباب میں اس کا حوالہ "ہندوی" کے نام سے ملتا ہے:

"او را سہ دیوانست: یکی بتازی و یکی بپارسی و یکی بہندوی"۔ ۵۹

سلمان کے "ہندی" دیوان کا ذکر امیر خسرو (۱۲۵۳-۱۳۲۵ء) نے بھی غرۃ الکمال کے دیباچے میں کیا ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ سلمان کی ہندوی یا ہندی کس قسم کی زبان تھی کیوں کہ ان کا دیوان دست یاب نہیں، لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ بیش اردو ہی کی کوئی شکل رہی ہوگی جو بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں شمالی ہند میں رائج تھی۔

ذیل میں اس دور کی چند لسانی خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا مکمل ارتقا بعد کے دور کی اردو میں ہوا۔

● ہیم چندر شبدانوشاسن میں زبان کے جو نمونے پیش کیے گئے ہیں ان میں اسما، صفات اور افعال /آ/ پر ختم ہوتے ہیں۔ اردو کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔ مثالیں: بھلّا (بھلا)، ہُوا (ہوا)، مہارا (میرا)۔

● 'راسو' میں زمانۂ حال بنانے کے لیے مادّے کے ساتھ لاحقہ 'ت' کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً سُنت:

سو ہُوں سبیئے سُنت ہوں ماتا

(ماتا: وہ سب میں سنتا ہوں)

قدیم اردو تصنیف بکٹ کہانی (محمد افضل افضل) میں اس نوع کی شکلیں جابجا ملتی ہیں، مثلاً کرت، بھرت، جلت، چلت وغیرہ ؎

سبھی سکھیاں پیا سنگ سُکھ کرت ہیں

ہمن سی پا پیاں بنت دکھ بھرت ہیں

(بکٹ کہانی، شعر ۴۷)

ہمن اک آگ غم کی میں جلت ہیں

علاوہ دوسرے لُو واں چلت ہیں

(بکٹ کہانی، شعر ۲۶۹)

● ماضیِ مطلق بنانے کے لیے مادّے کے ساتھ 'یا'، 'یا' یا 'ئیا' کا استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً گورکھ ناتھ کے یہاں رہیا اور جریت ناتھ کے یہاں ملیا جیسی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ دکنی اردو میں 'یا' سے مرکب ماضیِ مطلق کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں۔ خالق باری (جس کا تعلق شمالی ہند سے ہے) میں بھی اس قسم کی مثالیں پائی گئی

ہیں، مثلاً رہیا، کہیا وغیرہ۔

● اردو ضمائر میں ہم، تم، مجھ، تجھ، وَہ (وہ) میرا، میرے، آپ، اپنے جو، اُن وغیرہ کا ارتقا ۱۰۰۰ء تا ۱۲۰۰ء کے دوران ہی عمل میں آچکا تھا۔[۵۰]

● کا، کی، کے حروف کی مثالیں پرتھوی راج راسو اور پرمل راسو دونوں میں ملتی ہیں۔[۵۱]

اس مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو زبان گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی کے دوران شمالی ہند میں بولی جاتی تھی وہ اس زبان سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی جو بعد کی صدیوں میں دہلی اور نواحِ دہلی میں ارتقا پذیر ہوئی، پھر دکن کی جانب منتقل ہوئی۔

۴

اُردو کے باقاعدہ آغاز کی تاریخ ۱۱۹۳ء تسلیم کی گئی ہے۔ یہی فتحِ دہلی کی بھی تاریخ ہے، جب کہ مسلمانوں نے پنجاب سے آکر دہلی کو اپنا مستقر بنایا۔ ان نو واردلوگوں میں عربی داں بھی تھے اور فارسی و ترکی بولنے والے بھی۔ لیکن کثیر تعداد ان تارکینِ وطن کی تھی جو پنجاب کی زبان بولتے تھے، کیوں کہ مسلمانوں نے پنجاب میں تقریباً دو سو سال تک قیام کرنے کے بعد دہلی کا رُخ کیا تھا۔ اس وقت دہلی اور نواحِ دہلی میں چار بولیاں — ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا اور میواتی رائج تھیں۔ مختلف قسم کے مقامی اور غیر مقامی لسانی اثرات یا امتزاج، نیز بنیادی زبان میں فطری تبدیلیوں کی وجہ سے زبان کی جو ایک نئی شکل معرضِ وجود میں آئی وہ ابتداءً ہندوی، ہندی، ریختہ اور بعد میں اردو کہلائی۔ اگرچہ اردو کسی نہ کسی شکل میں ۱۰۰۰ء سے شمالی ہند میں موجود تھی، لیکن ایک امتیازی زبان کی حیثیت سے اس کے آغاز و ابتدا کی تاریخ ۱۱۹۳ء ہی تسلیم کرنا ہوگی۔ شمالی ہندوستان میں اپنے ارتقا

کی پوری ایک صدی مکمل کر لینے کے بعد یہی زبان ۱۲۹۴ء میں دکن پہنچتی ہے جہاں اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) تک یہ آزادانہ طور پر پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے۔ دکن اور شمالی ہند میں ۱۲۰۰ء تا ۱۷۰۰ء کے دوران میں جس زبان کا ارتقا ہوا اُسے ہم 'قدیم اردو' کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

شمالی ہند میں قدیم اردو کے ابتدائی نمونوں کا مکمل فقدان ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ امیر خسرو (۱۲۵۳-۱۳۲۵ء) کی شاعری سے قطع نظر، تیرھویں چودھویں، پندرہویں اور سولھویں صدی عیسوی کے دوران شمالی ہند میں ارتقا پذیر ہونے والی زبان کا ایک بھی نقش دستیاب نہیں، جب کہ اسی زبان نے دکن پہنچ کر تقریباً انھیں صدیوں کے دوران میں قابلِ ذکر تصانیف پیش کیں۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ شمالی ہند میں اردو کئی سو سال تک محض بول چال کی زبان کی حیثیت سے استعمال ہوتی رہی اور فارسی کے غلبے کی وجہ سے اردو میں تصنیف و تالیف کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ۱۲۰۰ء تا ۱۷۰۰ء کے دوران شمالی ہند میں جو ادبی و لسانی سرمایہ ہمیں دستیاب ہوا ہے اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) صوفیائے کرام کے ملفوظات: شمالی ہند میں اردو کے بالکل ابتدائی نمونے صوفیائے کرام کے ملفوظات میں دیکھنے کو ملتے ہیں جو مختلف تذکروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مولوی عبدالحق (۱۸۶۹-۱۹۶۱ء) نے انھیں یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔[۱۲] شیخ فریدالدین گنج شکر، شیخ حمیدالدین ناگوری، شیخ بہاءالدین باجن، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ شرف الدین بوعلی قلندر، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ہمارے چند وہ بزرگ ہیں جن کے نام اردو کی ابتدائی نشو و نما کے سلسلے میں ہمیشہ لیے جاتے رہیں گے۔

شیخ فریدالدین گنج شکر (۷۲. - ۱۲۶۵ء) جنھیں بابا فرید بھی کہتے ہیں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (وفات ۱۲۳۵ء) کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ان کے ملفوظات اور اقوال مختلف تذکروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان سے منسوب چند فقرے یہ ہیں:

"پونوں کا چاند بھی بالا ہے۔"[۱۳]

"آنکھ آئی ہے۔"[۱۴]

شیخ فریدالدین شاعر بھی تھے۔ ان سے منسوب بعض پنجابی دوہے سکھوں کی مذہبی کتاب گروگرنتھ صاحب میں ملتے ہیں۔ ان کے کلام کا وہ نمونہ جو حافظ محمود خاں شیرانی (۱۸۸۰ - ۱۹۴۶ء) نے پنجاب میں اردو (۱۹۲۸ء) میں نقل کیا ہے، یہاں درج کیا جاتا ہے:

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
بادم خود ہمدم و ہشیار باش — صحبتِ اغیار بُری بات ہے
باتنِ تنہا چہ روی زیں زمیں — نیک عمل کن کہ وہی سات ہے

پندِ شکر گنج بدل جاں شنو
ضایع مکن عمر کہ ہیہات ہے[۱۵]

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر (وفات ۱۳۲۳ء) پانی پت کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے مبارز خاں کے ارادۂ سفر کے موقع پر یہ شعر کہا تھا:

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کو بھور کبھی نہ ہوئے

شیخ بوعلی قلندر، امیر خسرو (۱۲۵۳ - ۱۳۲۵ء) کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے

ایک موقع پر خسرو سے مخاطب ہو کر یہ جملہ کہا، جسے مولوی عبدالحق نے یوں نقل کیا ہے:

"تو کا سب کچھ سمجھ دا ہے۔"

(نوٹ: ایک تذکرے میں "تو کا" کے بجائے "ترکا" لکھا ہوا ملتا ہے)۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (وفات ۱۳۸۰ء) کا تعلق بہار سے تھا۔ بقول مولوی عبدالحق آپ پوربی اور ہندی بھاشا کے شاعر تھے۔ انھوں نے اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کام میں، ان کے دو دوہرے نقل کیے ہیں جو یہاں درج کیے جاتے ہیں:

کالا ہنسا نا ملا بسے سمندر تیر

پنکھ پسارے بکھ ہرے نرمل کرے سریر

درد رہے نہ پیڑ

شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے

گرد چھوئیں دربار کی سو درد دور ہو جائے

ان سے منسوب دو فقرے[۱۶] یہ ہیں:

"دیس بھلا پر دور"

"باٹ بھلی پر سا نہ کرے"

(۲) کتبِ تواریخ اور دیگر فارسی تصانیف میں اردو کے نمونے: قدیم اردو کے کچھ نمونے ان لفظوں، فقروں اور محاوروں میں دیکھے جا سکتے ہیں جو تاریخی اور دیگر موضوعات پر لکھی جانے والی فارسی تصانیف میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند تصانیف کے نام یہ ہیں، مثلاً تاریخِ فیروز شاہی، تاریخ داؤدی، تاریخ ہمایونی، توزکِ جہاں گیری، طبقاتِ ناصری، قرانِ السعدین، سیرالاولیا، خیرالمجالس، خزائن الفتوح وغیرہ۔ حافظ محمود خاں شیرانی (۱۸۸۰ - ۱۹۴۶ء) نے ان میں سے بعض تصانیف میں

پائے جانے والے اردو الفاظ و محاورات کی ایک طویل فہرست مرتب کی ہے، مثلاً منہاج سراج کی طبقات ناصری (۱۲۵۹ء) میں لک، بہار (بمعنی وہار)، سمندر، پایک (پیادہ) اور بہلہ جیسے الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ اسی طرح امیر خسرو نے قران السعدین (۱۲۸۹ء) میں چوترہ، راوت، پایک، پگ، کیورہ، سیوتی، بیل، مولسری، تنبول، بیرہ، چونہ وغیرہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ خزائن الفتوح (۱۳۱۰ء) میں جو اس دور کی ایک دوسری اہم فارسی تصنیف ہے، پایک، بیڑہ، تنبول، دھانک، گھٹی، وغیرہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ نیز ضیاءالدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی (۱۲۵۶ء) میں چبوترہ، لک، کہار، کھیت، جیتل، ہرن مار، ٹیکہ، کوتوال، مندل، کھنڈ، انبہ، چھپر، پٹواریاں، موری، موٹھی، پونڈہ، کھری، بیل، ڈیوٹ وغیرہ الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ اسی دور کی ایک اور اہم تصنیف سیرالاولیاء میں جس کے مصنف سید محمد بن سید مبارک کرمانی (وفات ۱۳۶۸ء) ہیں، چند دوسرے الفاظ ملتے ہیں، مثلاً چنڈو گھر، جواری، پٹی، جہین، کریلہ، ڈولہ، بھوگا (عیش)، کھچڑی، پلنگ، پچھیری وغیرہ۔[۱۷]

(۳) امیر خسرو کی شاعری: قدیم اردو کے سب سے پہلے اور اہم مصنف حضرت امیر خسرو (۱۲۵۳ - ۱۳۲۵ء) تسلیم کیے گئے ہیں، جنھوں نے اپنی غزلیں اور پہیلیاں "زبانِ دہلوی" میں تصنیف کیں۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ دستیاب شدہ متون کی زبان میں اگر تحریفات نہ ہوئی ہوتیں تو آج خسرو کی تخلیقات اردو کی ابتدائی شکل کے بڑے اچھے نمونے ہمارے سامنے پیش کرتیں۔ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ خسرو سے منسوب بہت سی تخلیقات ان کی اپنی نہیں ہیں۔

خسرو کی ہندی (اردو) شاعری مشتبہ سہی، لیکن بہ قولِ پروفیسر مسعود حسین خاں "خسرو کے صاحب دیوان ہندی شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ کہ وہ فارسی،

ترکی اور عربی کے ساتھ ہندی زبان کے بھی ماہر تھے، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔"[۱۸]
خسرو نے گیت بھی لکھے ہیں اور پہیلیاں اور مکرنیاں بھی، لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں ریختہ گوئی کی روایت قائم کی جس میں کھڑی بولی کے اوّلین اور ابتدائی روپ ہمیں دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ خسرو سے منسوب ایک ریختہ یہ ہے:

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کوں ہماری بتیاں
چوں شمعِ سوزاں چوں ذرّہ حیراں ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپید من کو درائے راکھوں جو جان پاؤں پیا کی گھتیاں

خسرو کا یہ ریختہ اگرچہ کھڑی بولی میں ہے لیکن کہیں کہیں اس پر برج بھاشا کا بھی چھینٹا پڑ گیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین کا خیال ہے کہ خسرو کے یہاں ہمیں تین قسم کی زبان ملتی ہے۔ ٹھیٹھ کھڑی بولی، کھڑی اور برج بھاشا ملی ہوئی، اور خالص برج بھاشا۔ خسرو کے گیتوں کی زبان عام طور پر برج بھاشا ہے، لیکن ان کی پہیلیاں اور مکرنیاں وغیرہ کھڑی بولی یا کھڑی اور برج بھاشا ملی ہوئی زبان میں ہیں۔[۱۹]
خسرو کی زبان کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی بھی یہ رائے نہایت معقول ہے۔ وہ

لکھتے ہیں:

"ان کے کلام کو دیکھ کر دو باتوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک یہ کہ اب یہ زبان قدیم اپ بھرنش کے دائرے سے باہر نکل آئی ہے اور دہلی و اطراف دہلی کی زبانوں سے مل کر اپنی تشکیل کے ایک نئے دور میں داخل ہو گئی ہے جس پر کھڑی بولی اور برج بھاشا دونوں اثر انداز ہوئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اب ڈھل منجھ کر اتنی صاف ہو گئی ہے کہ اس میں شاعری کی جا سکے۔[۲۰]"

(۴) نام دیو، کبیر اور گرو نانک کے کلام میں اردو کے نمونے: اردو کی ابتدائی نشو و نما میں جہاں مسلمان صوفیوں کی خدمات لائقِ ستائش ہیں وہاں دوسرے سادھو سنتوں، بھگتوں اور مذہبی پیشواؤں کے کارنامے بھی قابلِ قدر ہیں۔ نام دیو (۱۲۷۰ - ۱۳۵۰ء)، کبیر داس (۱۳۹۸ - ۱۵۱۸ء) اور گرو نانک (۱۴۶۹ - ۱۵۳۹ء) نے کھڑی بولی کی شکل میں اردو کو شمالی ہند کے ایک بڑے حصے میں پھیلانے نیز پورے تا پنجاب اور پنجاب تا دکن رواج دینے میں نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے کلام میں کھڑی بولی یا زبانِ دہلوی (اردو) کا صاف اور نکھرا ہوا ابتدائی روپ محفوظ ہو گیا ہے، بلکہ پروفیسر مسعود حسین خاں کے الفاظ میں یہ زبان ان شعرا کے کلام میں "ممتاز ادبی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔[۲۱]"

نام دیو (۱۲۷۰ - ۱۳۵۰ء) کا تعلق مرہٹوارہ سے تھا۔ وہ بھگتی تحریک کے پرچارک اور مرہٹی زبان کے ایک مستند شاعر تھے۔ چوں کہ بھگتی کے پیغام کو وہ دور دور تک پھیلانا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے مرہٹی کے علاوہ کھڑی بولی میں بھی شاعری کی ہے۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں برج بھاشا کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ نام دیو کے چند مشہور دوہے یہ ہیں:

مائی نہ ہوتی، باپ نہ ہوتے، کرم نہ ہوتا کایا

ہم نہیں ہوتے، تم نہیں ہوتے، کون کہاں تے آتا
چند نہ ہوتا، سوُر نہ ہوتا، پانی یون ملایا
شاستر نہ ہوتا، وید نہ ہوتا، کرم کہاں تے آتا[۲۲]

---

میں اندھلے کی ٹیک تیرا نام کھوند کارہ
میں گریب میں مسکین تیرا نام ہے آدھارا[۲۳]

کبیر داس (۱۳۹۸ - ۱۵۱۸ء) کا تعلق پورب سے تھا وہ بنارس کے رہنے والے تھے لیکن ان کا انتقال مگہر (ضلع بستی) میں ہوا جہاں ان کا مزار اور سمادھی دونوں اب بھی موجود ہیں۔ کبیر بھگتی تحریک کے علمبردار اور اپنے دور کے ایک بڑے شاعر تھے۔ بہت سے دوسرے صوفیوں اور سنتوں کی طرح کبیر داس کا کلام بھی گرو گرنتھ صاحب میں شامل ہے۔ عالموں کا خیال ہے کہ تاریخی اور لسانی اعتبار سے یہ ان کا سب سے مستند کلام ہے۔ کبیر اگرچہ پورب کے رہنے والے تھے جہاں بھوجپوری بولی کا چلن تھا لیکن ان کے کلام میں بھوجپوری کے اثرات زیادہ نہیں پائے جاتے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ ان کے کلام میں "ایک ملی جلی زبان ملتی ہے جس سے کھڑی بولی، راجستھانی اور پنجابی تک کے اثرات جھلکتے ہیں" اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے اور 'تیرتھ یاترا' میں گذارا تھا۔ کبیر کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں عربی فارسی الفاظ کا آزادانہ استعمال ملتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو (دہلی، ۱۹۴۸ء) میں کبیر کے کلام کے عربی فارسی الفاظ کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کبیر کے یہاں شیرانی کے بقول دس فی صد تو نہیں، لیکن پانچ فی صد عربی فارسی الفاظ ضرور مل جائیں گے[۲۴] نمونے کے طور پر کبیر کے چند دوہے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دوئی پاٹ بھیتر آئی کے ثابت گیا نہ کوئے

---

ماٹی کہے کمھار سے تو کیا روندے موئے
اک دن ایسا ہوئے گا میں روندونگی توہ

---

سب تن جلتا دیکھ کر، بھیا کبیرا اُداس
کبیر سر پر سرائے ہے کیا سوئے سُکھ چین

---

کبیر کہتا جات ہوں سُنتا ہے سب کوئے
رام کہے بھلا ہوئے گا نہیں تر بھلا نہ ہوئے

گرونانک (۱۴۶۹ء - ۱۵۳۹ء) ایک مذہبی پیشوا ہونے کے علاوہ پنجابی کے ایک قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ ان کی پنجابی شاعری میں پنجابی کے ساتھ کھڑی بولی کے بھی الفاظ اور ترکیبیں ملتی ہیں اس سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کھڑی بولی یا زبانِ دہلوی (اردو)، "پورب اور دکن کے علاوہ پنجاب میں بھی اپنا گھر کر رہی تھی۔"[۴۴] گرونانک کے کلام کے بارے میں پروفیسر مسعود حسین خاں کی یہ رائے بہت صحیح ہے:

"لسانی نقطہ نظر سے گرونانک کا کلام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو نام دیو اور کبیر جیسے بھگتوں سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی ایک طرف فارسی عربی کے عام مروّجہ الفاظ کو جگہ دینا اور دوسری طرف ان لسانی اثرات کو بھی

قبول کرنا جو دہلی کے سرچشمے سے پھوٹ کر ہندوستان میں چاروں طرف پھیل رہے تھے۔"[۲۶]

عربی فارسی الفاظ کا استعمال نانک کے یہاں بھی بہت کثرت سے ہوا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ "عربی فارسی الفاظ کی جتنی کثرت نانک کے یہاں ملتی ہے، اس عہد کے دوسرے صوفی شعرار کے یہاں اس کی نظیر نہیں ملتی۔"[۲۷]
گرو نانک کا کلام سکھوں کی مذہبی کتاب گروگرنتھ صاحب میں محفوظ کر دیا گیا ہے جو یقیناً اُن کا مستند کلام ہے۔ گرو نانک کے مستند کلام کا ایک نمونہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

گرو پرسادی بوجھے تو ہوئی بنیرا گھر گھر نام نرنجنا سو ٹھاکر میرا
اندھے اکلی باہرے کیا تن سو کہئے بن گرو پنتھ نہ سوجھی کس دوہی نرہیئے
آوت کو جاتا کہیں، جاتے کو آیا پر کی کر اپنی کہیں، اپنو نہیں بھایا
میٹھے کو کڑوا کہیں، کڑوے کو میٹھا رانے کو نندا کریئں ایسا کل ماہی ڈیٹھا[۲۸]

شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۱۴۵۶ء۔ ۱۵۳۷ء) نے اپنے خطوط میں گرو نانک کا ایک دوہا نقل کیا ہے جو حسبِ ذیل ہے:

مویو پیاس نانک لہو پانی پیو سو رانڈ سہاگن نانوں[۲۹]

(۵) مستقل تصانیف : امیر خسرو کی شاعری کے بعد شمالی ہند میں پورے تین سو سال تک مکمل سناٹا چھایا رہتا ہے۔ اس طویل خاموشی کے بعد سترھویں صدی کے اوائل میں پھر سے ادبی شعور کی روح بیدار ہوتی ہے اور از سرِ نو شعری فضا کے قائم ہونے کا سراغ ملتا ہے جس کا ثبوت محمد افضل افضلؔ (وفات ۱۶۲۵ء) کی بکٹ کہانی ہے، جسے پروفیسر مسعود حسین خاں نے بجا طور پر "شمالی ہند میں اردو شاعری کا پہلا مستند نمونہ" قرار دیا ہے۔[۳۰] بکٹ کہانی کا صحیح سالِ تصنیف معلوم نہیں، لیکن افضلؔ نے

۱۶۲۵ء سے قبل اسے مکمل کرلیا تھا۔ افضل کے نام اور وطن کے بارے میں محققین میں اختلاف رائے ہے[۳۲] لیکن بکٹ کہانی کے غیر مستند یا غیر مصدقہ ہونے کا اب تک کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوا ہے۔ بکٹ کہانی کو "بارہ ماسہ" بھی کہتے ہیں۔ اس میں جا بجا فارسی کے فقروں اور مصرعوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ برج کے اثرات بھی اس میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ مصنف کے حالاتِ زندگی سے واقفیت کے بعد اس کی وجہ بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریختہ گوئی کی جو بنیاد خسرو نے شمالی ہند میں تین سو سال پہلے ڈالی تھی، بکٹ کہانی اس کا شاندار تسلسل ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کے الفاظ میں "اسلوبِ شعر کے نقطۂ نظر سے بکٹ کہانی اس عہد کی ریختہ گوئی کا مکمل نقش ہے۔"[۳۳]

بکٹ کہانی چونکہ ایک قدیم تصنیف ہے اس لیے اس کی لسانی اہمیت اور حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے[۳۴]، لیکن خالص ادبی نقطۂ نظر سے اور ادبی خصوصیات کے لحاظ سے بھی اس کا درجہ نہایت بلند ہے۔ بکٹ کہانی ہندی شاعری کی روایت کے عین مطابق لکھی گئی ہے جس میں اظہارِ عشق اور تخاطب عورت کی جانب سے ہوتا ہے اور مرد کی حیثیت 'بتِ خاموش' کی سی ہوتی ہے، چناں چہ بکٹ کہانی میں ایک ایسی عورت (برہنی) کی داستانِ ہجر بیان کی گئی ہے جو اپنے شوہر (پیا) کے فراق میں رات دن تڑپتی رہتی ہے اور اپنے عشقیہ جذبات اور ہجر و غم کی داخلی کیفیات کو سال کے بارہ مہینوں (ساون تا اساڑھ) کی مختلف خارجی کیفیات سے ہم آہنگ کرکے پیش کرتی ہے۔ وہ اپنی سکھیوں اور سہیلیوں کو بھی اپنا ہم راز بناتی ہے، لیکن کبھی کبھی ان سے جلتی بھی ہے۔ اس کے جذبے کے اظہار میں شدت اور فراق کے بیان میں سچائی پائی جاتی ہے۔ بہ قول پروفیسر مسعود حسین خاں "اس میں صنفِ نازک کا دل اپنی تمام حرماں نصیبیوں، امنگوں، پیار، جلن اور جلاپے کے ساتھ دھڑکتا دکھائی دیتا ہے۔"[۳۵] بکٹ کہانی کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:

سنو سکھیو! بکٹ میری کہانی
بھئی ہوں عشق کے غم سوں دِوانی
نہ مجھ کو بھوک دن، نا نیند راتا
برہ کے درد سوں سینہ پراتا
تمامی لوک مجھ بوری کہے ری
خرد گم کردہ مجنوں ہو رہی ری

(بکٹ کہانی، ص ۳۱)

فراق کی ماری برہنی ایک جگہ اپنے دکھ کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہے:

سنو سکھیو کہ رُت آسوج آئی
پیارے کی خبر اب لگ نہ پائی
کہو کیسے جیویں بیو باج ناری
جنھیں روو تے گئی ہے عمر ساری
لکھوں پتیاں ارے، اے کاگ! لے جا
سلونے، سانورے، سُندر پیا پا
کلیجہ کاڑ کر تجھ کو کھلاؤں
ترے دو پنکھ پر بلہار جاؤں

(بکٹ کہانی، ص ۴۰)

بکٹ کہانی کی ترتیب اجزا کے لحاظ سے بارہواں مہینہ اساڑھ کا ہوتا ہے جو مژدۂ وصل سناتا ہے۔ اس مہینے میں اس عورت کا 'پیا' پردیس سے اپنے گھر واپس آتا ہے۔ عورت کا دل جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہی دیوانی ہو اٹھتی ہے اور اس کے قدموں پر جا گرتی ہے۔ اس موقع کی تصویر دیکھیے:

چڑھی بینم لٹکتا آوتا ہے
بہ جُنبش ماہ راشر ماوتا ہے

کیا ہے اُن لباس زعفرانی
بھئی ہوں دیکھ کر اُس کو دِوانی

اری میں دوڑ کے پاؤں پڑی جائے
پیا نے کر پکڑ لینی، گلے لائے

بحمداللہ رہا جیو، یار پایا
تمامی عُمر کا دُکھڑا بھُلایا

(بکٹ کہانی، ص ۶۴)

عشق کے تجربات اس عورت کے لیے اتنے کٹھن اور ہجر کے ایام اتنے تلخ اور صبر آزما ہوتے ہیں کہ وہ آخر میں دوسروں کو عشق سے باز رہنے کی تلقین کرتی ہے:

اری آساں نہ جانو عشق کرنا
تمن اس آگ مول ہرگز نہ پڑنا

درایں رہ یک قدم بہبودگی نیست
بجُز اندوہ پا آسودگی نیست

ارے یہ عشق کا پھندا بکٹ ہے
نپٹ مشکل، نپٹ مشکل، نپٹ ہے

(بکٹ کہانی، ص ۶۵)

بکٹ کہانی کے بعد شمالی ہند کی دوسری اہم شعری تصنیف عاشور نامہ [۳۶] ہے جو تین ہزار پانچ سو چوالیس اشعار پر مشتمل واقعاتِ کربلا سے متعلق مثنوی کی شکل میں ایک طویل رزمیہ نظم ہے۔ اس کے مصنف روشن علی کا تعلق "سہارنگ پور" (موجودہ

سہارن پور[۳۷] سے ہے۔ عاشور نامہ کا سالِ تصنیف ۱۶۸۸ء ہے۔ یہ شمالی ہند کا قدیم ترین شہادت نامہ ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اسے شمالی ہند کے قدیم ترین ذخیرۂ ادب کی ایک اہم دستاویز[۳۸] کہا ہے۔ روشن علی ایک "عوامی شاعر" کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی زبان بالائی دوآب کی "قصباتی" زبان ہے۔ جہاں تک عاشور نامہ کی زبان کا تعلق ہے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سترھویں صدی عیسوی کے اواخر کی وہ زبان ہے جو موجودہ مغربی یوپی کے بالائی دوآب میں رائج تھی۔[۳۹]

بہ قولِ پروفیسر مسعود حسین خاں ادبی خصوصیات کے لحاظ سے یہ مثنوی ایک مایوس کن تصنیف ہے کیوں کہ "اس کا مصنف صنائع بدائع تو کجا اوزان و بحور اور قافیہ و ردیف کے رموز تک سے ناواقف ہے۔ ایک طرف اس میں ریختہ کی وہ رنگینی مفقود ہے جو بکٹ کہانی میں پائی جاتی ہے۔ دوسری طرف وہ ان محاسنِ شعری سے بھی عاری ہے جو معاصر مرثیہ نگار یا اسمٰعیل امروہوی کی مثنویات میں ملتے ہیں"[۴۰]

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، عاشور نامہ واقعاتِ کربلا پر مبنی ایک طویل رزمیہ نظم ہے جس میں حضرت امام حسن کو زہر دیے جانے کے واقعے سے لے کر حضرت امام حسین کی شہادت اور اس کے بعد اہلِ بیت پر یزیدی فوجوں کے مظالم اور ان تمام واقعات کی جزئیات، نیز فوجوں کی صف آرائی اور لڑائی، اور اس قسم کے دوسرے واقعات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہ "مرثیہ کم اور شہادت نامہ یا جنگ نامہ زیادہ" معلوم ہوتا ہے۔ عاشور نامہ میں جنگ کا ایک منظر یوں بیان کیا گیا ہے:

لگی ہونے چو طرف سے مار مار ‏ ‏ چلے تیر، شمشیر، جمدھر، کٹار
رفیق تھے جوان کے بہادر جواں ‏ ‏ تلواروں سے مارے بہت کوفیاں
جدھر کو پھریں وہ بہادر جواں ‏ ‏ نہ طاقت کسی کو جو آوے وہاں

جو آوے مقابل وہ جاوے نہیں اسی خوف سے کوئی آوے نہیں
کریں جس پہ حملہ اُسے ڈالیں مار گئے ہٹ کے آخر وہ سب نابکار
یزیدی کا لشکر جو بھاگا وہاں گئے چھوڑ کر کھیت سب کوفیاں

(عاشور نامہ، ص ۸۳)

حضرت امام حسین کی شہادت کے بعد لوگوں کا جو حال ہوا اس کا نقشہ شاعر نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

روویں اہلِ بیتیں وہ سر پھوڑ کر کہا، یا الٰہی ہوا کیا قہر
یہ زینب پکاری کیا کیا خدا حسین بھائی ہم سے کیا کیوں جدا
سکینہ و کلثوم کھاتی پچھاڑ وہ کبریٰ نے لیے بال سر کے اکھاڑ

(عاشور نامہ، ص ۱۵۶)

سید مسعود حسن رضوی ادیب (۱۸۹۳ - ۱۹۷۵ء) نے مراثی ریختہ کے نام سے ایک شعری مجموعہ ترتیب دیا تھا جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔[۱۶۱] اس مجموعے میں تقریباً ایک سو پچاس قدیم اردو مرثیے شامل ہیں۔ یہ مرثیے شمالی ہند کے مختلف شعرا کے لکھے ہوئے ہیں جن میں صلاح، قربان، قاسم وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مراثیِ ریختہ کے زمانے کا تعین نہیں ہو سکا ہے لیکن اتنی بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کا تعلق سترھویں صدی کے اواخر یا اٹھارویں صدی کے اوائل سے ہے کیوں کہ ان مراثی کا ماخذ ۱۷۳۸ء کی لکھی ہوئی ایک بیاض ہے۔[۱۶۲]

مراثی ریختہ کی زبان بکٹ کہانی کی زبان کی طرح ریختہ آمیز ہے، لیکن برج کے اثرات اس میں دیکھنے کو نہیں ملتے۔ اگرچہ قدیم اردو کی لسانی خصوصیات اس میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن کہیں کہیں کھڑی بولی کا بالکل نکھرا ہوا روپ سامنے آجاتا ہے۔ مراثی ریختہ کی زبان میں "قصباتیت" کا بھی وہ عنصر نہیں جو عاشور نامہ کی زبان

کی ایک اہم خامی یا خوبی ہے، مثالیں:

ہے ہے ہوا شہید پسر بو تراب کا
غم سوں ہوا کباب جگر شیخ و شاب کا

ماتم خدا کے گھر موں پڑا ہے از یں عزا
ابتر شدہ است حال جہانِ خراب کا

جب سوں گیا ہے گرسنہ و تشنہ آں امام
تب سوں نہیں رہا ہے مزہ نان و آب کا

جن نے کیا ہے آلِ نبی پر جفا و جور
وہ مستحق ہوا ہے خدا کے عذاب کا

اے مومناں بہ درد و الم روز و شب رہو
اندیشہ دِل سوں محو کرو خورد و خواب کا

(صلاح)

اے مومناں ماتم کرو آیا محرم درجہاں
اے دوستاں باغم رہو آیا محرم درجہاں

خونِ جگر از دیدہ ہا جاری کرو سیلا بہا
بہرِ امام رہ نما آیا محرم درجہاں

روح الامین و قدسیاں ماتم کریں دَر آسماں
حوران و غلماں ہوئیاں آیا محرم درجہاں

دنیا ہوا زیرو زبر ہر روز ہوتا ہے تبر
بیتاب ہے جان و جگر آیا محرم درجہاں

فرزندِ شاہِ مومناں تنہا لڑا با کافراں
لعنت کرو بر کوفیاں آیا محرم درجہاں

(قاسم)

رفتہ سبطِ احمدِ مختار آہ
یادگارِ حیدرِ کرار آہ

تھا پیا سا بر لبِ آبِ فرات
نورِ چشمِ سیدِ ابرار آہ

باشہ دیں از رہِ بغض و نفاق
شاہ کو کوئی کیے پیکار آہ

کربلا موں قرۃ العینِ رسول
کشتہ شد از کافرِ خونخوار آہ

ہست زیں اندوہ روح فاطمہ
روز و شب با دیدۂ خوں بار آہ

(قربان)

سترھویں صدی کی آخری اہم تصنیف ایک مثنوی "وفات نامۂ بی بی (فاطمہ)" ہے جو اسمٰعیل امروہوی (وفات ۱۷۱۱ء) نے ۱۶۹۳ء میں قلم بند کی تھی۔ اسمٰعیل ہی کی ایک

اور مثنوی معجزۂ انار ہے جس کا سالِ تصنیف ۱۷۰۸ء ہے۔ یہ دونوں مثنویاں اردو کی دو قدیم مثنویاں کے نام سے نائب حسین نقوی نے مرتب کر کے شائع کر دی ہیں۔[۴۳] ان مثنویوں کا اگر عاشور نامہ (۱۶۸۸ء) سے مقابلہ کیا جائے تو ان میں زبان کی بیشتر خصوصیات مشترک نظر آئیں گی۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان فصلِ زمانی زیادہ نہیں ہے اور روشن علی اور اسمٰعیل امروہوی دونوں ہم عصر شاعر ہیں۔ ایک اور خصوصیت جو دونوں شاعروں میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ دونوں ہی "قصباتی شاعر" ہیں۔ اسمٰعیل کی مثنویوں میں خال خال دکنی زبان کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ وفات نامۂ بی بی (فاطمہ) کے چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

اوسی وقت بھیجا خدا پاک نے ۔۔۔ بہشتاں تے حوراں ایجال منے
ہر یک ہاتھ طشتی مراحی جو تھی ۔۔۔ خدیجہ کی وے پاس بیٹھی تبھی
لے کر فاطمہ کوں انوں پاس تی ۔۔۔ دھویا رنگ سارا اسی آب تی
وہی آب ابریق موں تھا تمام ۔۔۔ کہ تھا آب کوثر اسی کا چ نام
غسل دے اسے آب فارغ ہو کو ۔۔۔ پہرایا پیراہن سفید، تن اوپر

مثنوی معجزۂ انار کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سنا ہوں، مدینہ میں ہے یک نبی ۔۔۔ خدا نے جو محبوب کیتا سبھی
خدا نے حُسن بہوت دیتا جمال ۔۔۔ نہ ویسا کوئی دو جہاں خوش خصال
ہر اک طرف مشہور ہے ان کا نام ۔۔۔ "خدا کے نبی" خلق کہتی تمام

اس ضمن میں چند اور قدیم تصانیف مثلاً کتب شتنک، خالق باری، مثل خالق باری، قصیدہ در لغات ہندی، فقہ ہندی وغیرہ کا بھی ذکر بے جا نہ ہوگا۔ یہ کتابیں ادبی اعتبار سے اتنی اہم نہ سہی لیکن زبان کے نقطۂ نظر سے یقیناً اہمیت

کی حامل ہیں۔

کتب شتک جسے ماتا پرشاد گپت نے مرتب کر کے شائع کیا ہے "شمالی ہند میں لسانیاتی نقطۂ نظر سے سب سے اہم اور مستند تصنیف ہے جس میں کھڑی بولی کے روپ محفوظ ہیں۔"[۴۴] یہ تقریباً ۱۵۷۵ء سے قبل کی تصنیف ہے کیوں کہ اس کے قدیم ترین مخطوطے پر یہی سنہ کتابت درج ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ یہ غالباً فیروز تغلق کے عہد کی ایک عاشقانہ داستان ہے جس کا ہیرو خود فیروز (پیروز) کا بیٹا ہے۔[۴۵]

خالق باری ضیاءالدین خسرو کی تصنیف ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۶۲۱ء ہے۔ یہ ایک منظوم لغت ہے جو مبتدیوں کو فارسی زبان سکھانے کی غرض سے لکھی گئی تھی۔ یہ حفظ اللسان کے نام سے بھی معروف ہے۔ خالق باری کو لوگ بہت دنوں تک امیر خسرو (۱۲۵۳ - ۱۳۲۵ء) کی تصنیف سمجھتے رہے ہیں۔[۴۶] لیکن اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ جہاں گیر (وفات ۱۶۲۷ء) کے عہد کے کسی ضیاءالدین خسرو کی تصنیف ہے اور امیر خسرو سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کتاب قواعد کے اعتبار سے اتنی اہم نہیں ہے جتنی کہ لغوی اور صوتیاتی اعتبار سے اہم ہے۔ اس کتاب میں فارسی کے جو ہندی (اردو) مترادفات دیے ہوئے ہیں ان سے نہ صرف اس دور کے تلفظ اور املا، نیز زبان کی صوتی اور املائی تبدیلیوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ اردو الفاظ کے چلن اور ان کی تہذیبی و عمرانی حیثیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ خالق باری کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:

خالق باری سرجن ہار واحد ایک بڑا کرتار
اسم اللہ خدا کا نانو گرما دھوپ سایہ چھاؤں

خالق باری (۱۶۲۱ء) سے تقریباً ستر سال قبل یعنی ۵۲/۱۵۵۳ء میں اجے چند پسر دنی چند ساکنِ شہر سکندر آباد نے بھی ایک منظوم لغت لکھا تھا[۴۷] جس کا قلمی نسخہ

انجمن ترقیِ اردو (پاکستان) کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ مولوی عبدالحق (۱۸۶۹ء-۱۹۶۱ء) کا خیال ہے کہ خالق باری یا اس قسم کی جتنی کتابیں اس سے قبل لکھی گئیں ان میں یہ کتاب سب سے قدیم ہے جن اشعار سے تاریخِ تصنیف اور مصنف کے نام اور وطن کے بارے میں پتا چلتا ہے وہ یہ ہیں:

درسن نہ صدو شصت حسابے[۴۸] بتوفیق حق شد کتابے

لغت فارسی ہندوی سخن نظم نمودن جزوی

اجے چند بھٹناگر بندا پسر دنی چند شعر کنندا

کرم بحرم فرماں داد ساکن شہر سکندر آباد

متصل دارالملک مقام حضرت دہلی نادر نام

بہ قول مولوی عبدالحق، مصنف نے اپنے اور کتاب کے متعلق بہت کچھ بتادیا ہے لیکن کتاب کا نام کہیں نہیں بتایا[۴۹]۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے اس تصنیف کو مثلِ خالق باری کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ تصنیف ۲۷۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز "حمد" سے ہوتا ہے:

باری تعالیٰ نام گوسائیں بسے بزرگ بہت بڑائی

خالق جن جگ پیدا کیا رازق سب کو بھوجن دیا

واحد ایک پرستش پوجا لاشریک کوئی اور نہ دوجا

مادر پدر نہ مائی باپ ہست خودی خود آپی آپ

پوری کتاب میں موضوع کے اعتبار سے مختلف عنوانات قائم کیے گئے ہیں جن کی تعداد ۲۹ ہے۔ شروع کے تین عنوانات، مدح، آغازِ کتاب اور مدحِ بادشاہ کو چھوڑ کر بقیہ تمام عنوانات کسی نہ کسی "خانہ" سے متعلق ہیں۔ مثلاً مطبخ خانہ، خزانہ خانہ، پائگاہ خانہ، فیل خانہ، شترخانہ وغیرہ۔ چوں کہ اجے چند کی تصنیف اس دور کے 'نصاب'

کے لیے لکھی گئی تھی اس لیے اس کے مصنف نے ہر عنوان کے تحت اس سے متعلق فارسی الفاظ و محاورات اور ان کے ہندی (اردو) مترادفات یکجا کر دیے ہیں۔ الفاظ کے علاوہ اس میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور فقرے بھی آئے ہیں جو آج کل بھی تقریباً اسی طرح بولے جاتے ہیں، مثلاً کہہ نہ سکوں/گفتم نہ توانم، تنہا ماندن/رہے اکیلا، زاغ سیہ ہے/کوا کالا وغیرہ۔ بعض جگہ ہندی مترادفات کے لیے فارسی کے ہم معنی عربی الفاظ بھی دیے گئے ہیں، مثلاً حوت ماہی مچھلی جان/خبز نان درہندی روٹی/ بزم مجلس سبھا پہچان وغیرہ۔

خالق باری مرتب کرتے وقت حافظ محمود شیرانی (۱۸۸۰ - ۱۹۴۶ء) نے اس کے دیباچۂ اوّل و دیباچۂ دوم میں خالق باری کا بڑی تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور اس طرز پر لکھے جانے والے بہت سے نصابوں، مثلاً نصاب الصبیان، قصیدہ در لغاتِ ہندی، اللہ خدائی، حمد باری، اللہ باری حمد باری وغیرہ کا ذکر کیا ہے، لیکن اجے چند کی اس تصنیف کا ذکر ان کے دیباچوں میں کہیں نظر نہیں آتا۔ شیرانی کے خیال میں "اردو نصابوں کا سلسلہ دسویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے[۵۵]۔" انھوں نے دسویں صدی ہجری کے نصفِ اوّل کے ایک بزرگ حکیم یوسفی کا ذکر کیا ہے جنھوں نے قصیدہ در لغاتِ ہندی کے نام سے ایک نظم لکھی تھی جس میں فارسی الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کے ہندی (اردو) مترادفات دیے ہوئے ہیں اور جن پر بہ قولِ شیرانی 'نصاب' کی تعریف عملاً صادق آتی ہے۔ اجے چند اپنا نصاب دسویں صدی ہجری کی چھٹی دہائی میں مکمل کرتا ہے۔ خالق باری مرتب کرتے وقت حافظ محمود شیرانی کو اجے چند کے نصاب کا غالباً بالکل علم نہ تھا ورنہ قصیدہ در لغاتِ ہندی کے ساتھ وہ اس کا بھی ذکر کرتے۔ حکیم یوسفی کے لغاتِ ہندی اور اجے چند کی تصنیف کے زمانے میں کوئی بہت زیادہ عرصے کا فرق نہیں

ہے۔ اجے چند اپنی تصنیف ۹۶۰ھ مطابق ۵۳/۱۵۵۲ء میں مکمل کرلیتا ہے اور حکیم یوسفی کی تصنیف قصیدہ در لغاتِ ہندی ۹۵۰ھ مطابق ۴۴/۱۵۴۳ء کے لگ بھگ یا اس سے کچھ پہلے لکھی جاتی ہے۔ خالق باری کے مصنف ضیاءالدین خسرو کے بارے میں یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ اسے اجے چند کے نصاب کا علم تھا یا نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ضیاءالدین خسرو کو اس نصاب کا علم رہا ہو اور اس نے خالق باری اسی کے تتبع میں لکھی ہو جس طرح خالق باری کے تتبع میں دوسرے بہت سے نصاب تیار کیے گئے۔

قصیدہ در لغات ہندی ہرات کے رہنے والے ایک بزرگ حکیم یوسفی کی تصنیف ہے جو ترکِ وطن کر کے ہندوستان آگئے تھے ان کا خاص میدان طب تھا۔ طب سے متعلق انھوں نے کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ قصیدہ در لغات ہندی میں فارسی الفاظ کے ہندی (اردو) مترادفات دیے ہوئے ہیں۔ بہ قول شیرانی "نظم میں شاید یہی قدیم نمونہ ہے جو ہندی الفاظ سے بحث کرتا ہے۔" اس کے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

آنکھ چشم و ناک بینی بون ابرو ہوتھ لب
دند دنداں کارہ گردن گوتھ زانو مونڈ سر

کھال پوست و ہڈ مغز و استخواں گویند ہاڈ
انگلی انگشت باشد انگوتھ انگشت نر

ہست پیشانی متھ و سینہ چھاتی دست ہتھ
موہ روی و چل رواں شو بیٹھ بنشیں دیکھ نگر

چاول و چینبہ برنج وارزن آندہ تخم مرغ
تل بود کنجد جواری زرت اے فرخندہ فر

ریشم است ابریشم وکالا سپیہ اجلا سپید
سرمہ کاجل مرچ فلفل سعد موتہ عود اگر

حکیم یوسفی کی ایک اور طبی تصنیف ریاض الادویہ ہے جس میں مختلف حیوانات اور دواؤں کے اردو مترادفات دیے ہوئے ہیں۔

اسی ضمن میں شیخ عبداللہ انصاری کی فقہ ہندی کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا یہ ایک منظوم رسالہ ہے جس میں اسلامی فقہ اور دوسرے مذہبی مسائل کو بیان کیا گیا ہے، اور کوشش کی گئی ہے عام آدمی بھی اس سے استفادہ کر سکے۔ یہ رسالہ قصیدہ در لغات ہندی کے تقریباً سو سال بعد لکھا گیا۔ اس کی زبان کا اندازہ ذیل کے اشعار[۵۵] سے لگایا جا سکتا ہے:

مطلب مسئلہ بوجھنا فرض عین کے جان عربی، ترکی، فارسی، ہندی یا افغان
علم شریعت بوجھنا فرض عین کے جان بالغ عورت مرد کوں جو ہووے مسلمان

(۶) اردو کے کچھ اور نمونے: فتح دہلی (۱۱۹۳ء) سے لے کر اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) تک، یعنی موٹے طور پر ۱۲۰۰ء تا ۱۷۰۰ء کے درمیان شمالی ہند میں اردو کے جن ادبی و لسانی کارناموں کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے، ان میں اردو کے کچھ اور نمونوں کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے جو اس زبان کے تدریجی ارتقا کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان نمونوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زبان نہ صرف عوام کی زبان تھی بلکہ شاہانِ وقت بھی آہستہ آہستہ اس کی جانب متوجہ ہو رہے تھے۔

اس ضمن میں ظہیر الدین بابر (وفات ۱۵۳۰ء) کے اس اردو مصرعے کا ذکر بے جا نہ ہوگا جو اس کے ترکی دیوان میں موجود ہے:

مُجھ کا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا ہلیغہ بس بولغوسیدور پانی و روتی

اس شعر کا پہلا مصرع تو خالصتاً اردو میں ہے۔ دوسرے مصرعے میں بھی "پانی" اور "روتی" (روٹی) اردو الفاظ ہیں۔ اس بات کی سند موجود ہے کہ یہ شعر بابر ہی کا ہے، کسی دوسرے شاعر کا نہیں۔

اکبر (وفات ۱۶۰۵ء) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہندی (اردو) زبان سے واقف تھا اور اپنی ہندو رانیوں سے اسی زبان میں بات چیت کرتا تھا۔ چندر بلی پانڈے نے اپنی کتاب مغل بادشاہوں کی ہندی میں لکھا ہے کہ اکبر برج بھاشا میں شعر کہتا تھا۔[۵۳] سُنیتی کمار چٹرجی نے انڈو آرین اینڈ ہندی (۱۹۴۲ء) میں اکبر کا یہ دوہا نقل کیا ہے[۵۴]:

جاکو جس ہے جگت میں، جگت سراہے جاہی
تاکو جنم سپھل ہے، کہت اکبر ساہی

(جسے دنیا میں شہرت حاصل ہے، اور جس کی دنیا تعریف کرتی ہے، اس کی زندگی کامیاب ہے: اکبر بادشاہ یہی بات کہتا ہے)۔

جہاں گیر (وفات ۱۶۲۷ء) کو بھی ہندی (اردو) زبان سے خاص دلچسپی تھی۔ تو زکِ جہاں گیری میں اردو زبان کے الفاظ بہ کثرت پائے جاتے ہیں، مثلاً تالاب، گھڑی، سنگھاسن، بلی، تھانہ، بوٹا، پکا، کٹوری، کھچڑی، باجرہ، باڑی، چوکیدار، ٹیکہ، گوٹ، کٹارہ، چبوترہ، گولی، اُدبلاؤ، مگرمچھ، ڈاک چوکی، جھروکہ، ساون، کڑہ، کویل، ہریل وغیرہ۔[۵۵]

شاہ جہاں (وفات ۱۶۶۶ء) کے عہد تک پہنچتے پہنچتے اردو کا چلن عام ہو چکا تھا اور فارسی کے ساتھ ساتھ اربابِ اقتدار اردو سے بھی واقف ہونے لگے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جہاں اس زبان سے نہ صرف واقف تھا بلکہ اس میں گفتگو بھی کر سکتا تھا۔ اس بات کا بھی انکشاف ہوا ہے کہ شاہ جہاں حسبِ ضرورت اس زبان میں

خط و کتابت بھی کرتا تھا۔[۵۶]

شاہ جہاں کے عہد میں اردو اپنے لسانی ارتقا کی جس منزل تک پہنچ چکی تھی اور جس طرح کے ادبی اظہار کا کام اس سے لیا جانے لگا تھا اس کا اندازہ اس دور کے ایک شاعر پنڈت چندر بھان برہمن (۱۵۷۴ - ۱۶۶۲ء) کی اس غزل[۵۷] سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے:

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کس سیں
نہ تسبی ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے

خوباں کے باغ میں رونق ہووے تو کس طرح یاراں
نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے

پیا کے ناؤں عاشق کوں قتل با عجب دیکھے ہوں
نہ برچھیا ہے نہ کرچھیا ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا میں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

۵

اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد سے سلطنتِ مغلیہ کے زوال کی ایک طویل داستان شروع ہوتی ہے۔ یہی اردو کے مکمل ارتقا، اس کے بھرپور شباب اور پورے عروج کا زمانہ ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں فارسی کا بھی زوال شروع ہوا۔ جب فارسی روبہ زوال ہونے لگی تو شمالی ہند کے فارسی شعرا اردو میں شعر کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح بول چال کی زبان کے علاوہ

اردو ادبی و شعری وسیلۂ اظہار کی حیثیت سے بھی پہچانی جانے لگی، تاہم اس کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی اور ادبی زبان کی حیثیت سے یہ اس دور میں کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام نہ دے سکی، کیوں کہ یہ فارسی شعرا محض "تفننِ طبع" کے طور پر اور محض منہ کا مزہ بدلنے کی خاطر اردو میں شعر کہا کرتے تھے۔ عین اسی موقع پر ولی دکنی کی دلّی میں آمد (۱۷۰۰ء) کا اعلان ہوا۔ ولی کے اردو کلام کو دیکھ کر لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کے دیوان کی دلّی کے ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ ان کے اشعار وہاں کے گلی کوچوں اور محفلوں میں گنگنائے جانے لگے۔ اس ادبی جوش و خروش سے ایک نئے ادبی دور کا آغاز ہوا۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کا باقاعدہ طور پر آغاز اٹھارویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے اور سب سے پہلے باقاعدہ شاعر میر جعفر زٹلی (وفات ۱۷۱۳ء) قرار پاتے ہیں۔[۵۵] زٹلی کی شاعری کو محض "پھکڑپن" کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں پر خواہ وہ بادشاہِ وقت ہی کیوں نہ ہوں بڑے تیکھے طنز کیے ہیں اور ان کی کوتاہیوں، خامیوں اور بداعمالیوں کے خوب خوب پول کھولے ہیں۔ ان کی شاعری میں اس دور کے مسائل و مصائب اور پریشانیوں کا ذکر جا بہ جا ملتا ہے۔ میر جعفر زٹلی کی یادگار ان کی کلیات ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گیا جو بنا اب کہاں پایئے　　اگر کانو رو دیس بھی جایئے
نہ تھا نبا تھنبے اب نہ راکھا رکھے　　نہ آوے یہ پھر سے کسی کے کہے

شنو اے طوطیِ روحانیِ من　　نہ کر الفت برنگیں پنجرۂ تن
نہ تو رہنی نہ یہ پنجرہ رہے گا　　بولا کر لال تجھ کو کیا کہے گا
جو پوچھے بات تجھ کو لال پیارا　　کہ پنجرے بیچ تیں کیا کیا سنوارا

زٹلی کی قدامت اور اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے، لیکن اس دور کا سب سے بڑا اور اہم شاعر فائز دہلوی (وفات ۱۷۳۸ء) ہے جس نے اپنا دیوان ۱۵/۱۷۱۴ء میں مرتب کیا۔ سیّد مسعود حسن رضوی ادیب (۱۸۹۳ - ۱۹۷۵ء) نے فائز کے حالاتِ زندگی کے ساتھ یہ دیوان شائع کر دیا ہے[59]۔ فائز کی ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

جب سجیلے خرام کرتے ہیں — ہر طرف قتلِ عام کرتے ہیں
مکھ دکھا، چھب بنا، لباس سنوار — عاشقوں کو غلام کرتے ہیں
یار کو عاشقانِ صاحبِ فن — ایک دیکھے میں رام کرتے ہیں
یہ نہیں نیک طور خوباں کے — آشنائی کو عام کرتے ہیں
شوخ میرا بتاں میں جب جاوے — اس کو اپنا امام کرتے ہیں

(دیوانِ فائز، ص ۲۰۵)

شمالی ہند کی اردو کی سب سے پہلی نثری تصنیف فضل علی فضلی کی کربل کتھا ہے جو ۳۳/۱۷۳۲ء میں لکھی گئی[60]۔ یہ کتاب ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے۔ کربل کتھا سے پہلے شمالی ہند میں نثر کا کوئی بھی نمونہ دستیاب نہیں ہوا ہے۔ اس کے مرتبین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ کتاب فارسی تصنیف کا لفظی ترجمہ نہیں ہے، بلکہ فضلی نے "اس کے مضمون اور مفاد کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، اس پر اضافہ بھی کیا ہے اور کہیں کہیں انحراف کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا"[61]۔ یہی وجہ ہے کہ کربل کتھا کو فضلی کی "مستقل تالیف" قرار دیا گیا ہے۔ کربل کتھا کی نثر کا نمونہ یہ ہے:

"تب ماں بہنیں اور پھوپھیاں خیمے سے دوڑیں اور علی اکبر کے پاؤں پڑ، رونے لگیں، حضرت بھی رخصت نہ دیتے تھے، اور علی اکبر رو رو عاجزی کر

سوگندیں دیتے تھے۔ لاچار حضرت زاری اور رونے اس کے سے، آپ
زرہ بکتر علی اکبر کوں پنھائے اور ٹیکا حضرت آدم کا اوس کر میں باندھ، خودِ
فولادی سر پر رکھ ہتھیار بندھائے۔ پھر ایک گھوڑے عقاب نام پر سوار فرمائے۔
ماں بہنیں علی اکبر کے گھوڑے کی باگ سے لپٹ رونے لگیں۔ تب حضرت فرمائے،
ہاتھ اس سے اوٹھا کہ قصد سفر آخرت رکھتا ہے"۔

(کربل کتھا، ص ۱۷۵)

اس دور کی دوسری اہم تصنیف قصۂ مہر افروز و دلبر ہے جو ۱۷۳۲ء اور ۱۷۵۹ء[۵۶۲]
کے دوران میں لکھی گئی۔ اس کا مصنف عیسوی خاں بہادر ہے۔ کربل کتھا ایک مذہبی
تصنیف ہے اور اس کی بنیاد سچے واقعے پر قائم ہے۔ اس کے برعکس قصۂ مہر افروز و دلبر کا
پورا پلاٹ من گھڑت غیر مذہبی اور سیکولر ہے کربل کتھا، روضۃ الشہداء کا ترجمہ ہے اور
قصہ ایک طبع زاد داستان ہے۔ کتھا میں جا بہ جا سلام، نوحے، مرثیے اور اشعار
کی بھرمار ہے۔ جب کہ قصہ از اول تا آخر مکمل نثر میں ہے۔ کربل کتھا اور قصۂ مہر افروز
و دلبر کی زبان میں بھی نمایاں فرق ہے۔ کتھا کی زبان فارسی الفاظ و عبارات سے بوجھل
ہے، جب کہ قصہ کی زبان آسان، سادہ صاف اور کئی لحاظ سے جدید ہے۔ بہ قولِ
پروفیسر مسعود حسین خاں "قصہ کی زبان خسرو کے عہد کی زبانِ دہلوی کی ترقی یافتہ
شکل ہے جس میں پنجابی اور ہریانی کے اثرات زائل ہو چکے ہیں"[۵۶۳]۔ عیسوی خاں بہادر
نے اس قصے کو اپنے عہد کی بول چال کی زبان میں پیش کیا ہے۔ قصۂ مہر افروز و
دلبر کی نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"تب گل رخ نے کہا کہ بلخ کا ایک بادشاہ تھا، شاہ عالم اس کا نانو
تھا۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ شکار میں وہ اپنی فوج سے علاحدہ پڑ جاتا
ہے اور راہ بھول جاتا ہے۔ دیکھے تو کیا، تو ایک جنگل بہت دلچسپ ہے اور

تالاب و عمارتیں بہت اچھی ہیں، اور درخت بہت سے گھن ہیں، تنھوں کے اوپر جانور ہر ایک طرح کے بولتے ہیں۔ بادشاہ کوں جو وہ جگہ اچھی لگتی ہے سو گھوڑے کوں تو ایک طرف اٹکا دیا اور آپ رات کے تائیں وہاں رہتا ہے تو وہ جگہ الماس بانو پری کی ہے، سو رات کے تائیں وہاں فرش ہوتا ہے۔ وہ آوتی ہے۔ راگ ناچ ہوتا ہے۔ بادشاہ جو اس پری کی صورت دیکھتا ہے (تو) بے اختیار عاشق ہوتا ہے۔"

(قصۂ مہر افروز و دلبر، ص ۱۲۹)

فضلی کے چھوٹے بھائی کرم علی کے سلام اور مرثیے بھی اسی دور کی یادگار ہیں ۲۴۔ کرم علی نے کثیر تعداد میں سلام اور مرثیے لکھے ہیں جن کا ایک ضخیم مجموعہ سید مسعود حسن رضوی ادیب کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے کرم علی کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

محبتاں! کہو مصطفٰے پر سلام ‏ ‏ پھر اس بعد شیرِ خدا پر سلام
بصدقِ دل و اعتقادِ درست ‏ ‏ کہو جگ کی خیر النسا پر سلام

---

ہے آج روزِ حشر عیاں وا مصیبتا ‏ ‏ ماتم میں ہیں زمین و زماں وا مصیبتا
روتی ہے کائنات سبھی کرکے شور و شین ‏ ‏ در ماتمِ امامِ زماں وا مصیبتا

---

اصغر شہ کے نور العین، خالی تیرا پالنا ‏ ‏ اماں رو رو کرتی بین، خالی تیرا پالنا
اصغر پیارے ماں سے بول، سوکھے ہونٹ اپنے ٹک کھول ‏ ‏ گھر کے آنگن میں اب ڈول، خالی تیرا پالنا
داغ لگا ہے اب کاری، جینا مجھ کو ہے بھاری ‏ ‏ اماں تجھ پر ہو واری، خالی تیرا پالنا

لسانی اعتبار سے ایک اور اہم تصنیف نوادر الالفاظ ۲۵ کا ذکر بھی بیجا نہ ہوگا جو اردو اور فارسی کے جید عالم خانِ آرزو (۱۶۸۷ - ۱۷۵۵ء) کی یادگار ہے۔ یہ میر عبد الواسع

ہانسوی کی غرائب اللغات کی تصحیح ہے۔ اٹھار ہویں صدی کے اوائل میں اردو زبان جن لسانی تبدیلیوں سے گذر رہی تھی ان کی ایک جھلک اس کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

شمالی ہند میں بدقسمتی سے نثر کے نمونوں کی بڑی کمی ہے۔ اردو کے آغاز (۱۱۹۳ء) سے ۱۷۰۰ء تک یعنی پورے پانچ سو سال تک اس زبان میں شمالی ہندوستان کی نثر کا ایک بھی نمونہ دستیاب نہیں ہیں۔ قدیم اردو کا تمام تر سرمایہ شعری ادب پر مشتمل ہے۔ خواجہ سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اردو زبان میں اخلاق و تصوّف کے موضوع پر ایک رسالہ ۱۳۰۸ء میں تصنیف کیا تھا لیکن آج تک کسی کو علم نہ ہو سکا کہ یہ رسالہ کہاں موجود ہے جناب مالک رام اور پروفیسر مختار الدین احمد نے کربل کتھا کے مقدّمے میں ایک رسالے صراطِ مستقیم معروف بہ سید ھاراستہ کا ذکر کیا ہے جو بہار میں ملا ہے۔ یہ رسالہ حضرت عماد الدین قلندر پھلواروی سے منسوب ہے اور اس کا سالِ تصنیف ۱۶۶۸/۶۹ء ہے لیکن محققین نے اس رسالے کو مستند نہیں مانا ہے اور نہ ہی حضرت عماد الدین قلندر کی طرف اس کی نسبت ثابت ہو سکی ہے۔

شمالی ہند میں نثری تصانیف کا سلسلہ صحیح معنوں میں اٹھار ہویں صدی کے دوسرے ربع سے شروع ہوتا ہے۔ اردو میں نثر کی سب سے پہلی کتاب کربل کتھا ہے۔ شمالی ہند میں اس سے پہلے کوئی نثری تصنیف اب تک دستیاب نہیں ہوئی ہے۔ شمالی ہند کی دوسری نثری تصنیف قصۂ مہر افروز و دلبر ہے۔ یہ دونوں تصانیف ۱۷۳۲ء اور ۱۷۵۹ء کے دوران میں لکھی گئیں۔ اس کے تقریباً چالیس برس بعد میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی نو طرزِ مرصع (۱۷۹۸ء) منظرِ عام پر آئی جو فارسی کے مشہور قصّے چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ نو طرزِ مرصع کی عبارت بے حد رنگین اور مرصّع ہے۔ جس میں فارسی و عربی الفاظ کی کثرت ہے۔ قصۂ مہر افروز و دلبر اور نو طرزِ مرصع کے درمیان چالیس سال کے فصلِ زمانی میں کلام پاک کے چند ترجموں سے قطعِ نظر نثر کی ایک بھی کتاب نہیں لکھی گئی۔ شاہ مولوی رفیع الدین

دہلوی نے ۱۷۸۰ء میں اور مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی نے ۱۷۹۰ء میں قرآن پاک کے ترجمے کیے۔ ان ترجموں کی عبارت آسان اور عام فہم ہے۔

## ۶

**اٹھارویں** صدی کے آغاز اورنگ زیب کی وفات، شمال و جنوب کے لوگوں میں میل جول، ولی کی دلّی میں آمد اور شمالی ہند میں اردو شاعری کے باقاعدہ ارتقا کے بعد سے تاریخِ زبانِ اردو کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے اور اردو اپنی لسانی قدامت کا چولا بدل کر اپنے ارتقا کے ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے اور بہ قول پروفیسر مسعود حسین خاں ایک "نیا محاورہ" جنم لیتا ہے۔ اس نئے محاورے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں پنجابی اور ہریانی کے لسانی اثرات کم ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب آگرے کی مرکزیت کی وجہ سے برج بھاشا کے جو اثرات اکبر اور جہانگیر کے عہد میں قائم ہو گئے تھے وہ دھیرے دھیرے ختم ہونے لگتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، شمالی ہند میں اردو شاعری کا باقاعدہ طور پر آغاز ولی کی دلّی میں آمد (۱۷۰۰ء) کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ جعفر زٹلی اور فائز دہلوی سے قطعِ نظر اٹھارویں صدی کے دوران میں شاعروں کے تین گروہ سامنے آتے ہیں، پہلا گروہ اٹھارویں صدی کے اوائل میں منظرِ عام پر آتا ہے۔ اس گروہ میں وہ فارسی گو شعرا شامل ہیں جو ولی کے اثر سے اردو میں بھی شعر کہنے لگتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان شعرا نے اردو شاعری کو سنجیدگی کے ساتھ اختیار نہیں کیا، لیکن اردو شاعری کی موافقت میں ایک انقلابی رویہ ضرور پیدا ہو گیا جس کی بنیادیں رفتہ رفتہ استوار ہوتی چلی گئیں۔ ان شعرا میں مرزا عبدالقادر بیدل، سعداللہ گلشن، سراج الدین علی خاں آرزو، مرتضیٰ قلی خاں فراق، سلیمان قلی خاں وداد، قزلباش خاں امید، اشرف علی خاں فغاں اور میر شمس الدین فقیر کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

دوسرے گروہ میں اٹھارہویں صدی کے وسط کے اردو کے متقدمین شعرار مثلاً شاہ مبارک آبرو، شاہ حاتم، غلام مصطفےٰ خاں یکرنگ، شیخ شرف الدین مضمون، محمد شاکر ناجی اور مرزا مظہر جانِ جاناں کا شمار ہوتا ہے جو تفننِ طبع یا منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اردو میں شعر نہیں کہتے بلکہ دلی جذبات وکیفیات کے سنجیدہ اظہار کے طور پر اردو شاعری اختیار کرتے ہیں، یہ شعرار فارسی کے ادبی غلبے کو ختم کر کے مکمل طور پر اردو کو اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ مشاعروں اور مراختوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ دیوان سازی کی طرف توجہ دی جاتی ہے اور زبان کی اصلاح ودرستی کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے، لیکن صحیح معنوں میں زبان کی صفائی اور ستھرائی اور لہجے کا نکھار اٹھارہویں صدی کے اواخر کے شعرار میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد اور میر حسن کے یہاں جاکر پیدا ہوتا ہے جو اٹھارہویں صدی کے تیسرے گروہ کے شاعر ہیں۔ ان شعرار کے ہاتھوں زبان کے دکنی اثرات کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ ہندی کے ٹھیٹھ، نامانوس اور قدیم الفاظ متروک قرار دیے جاتے ہیں اور ان کی جگہ عربی فارسی کے مناسب وموزوں، سبک اور سہل الاستعمال الفاظ کام میں لائے جاتے ہیں۔ زبان میں وسعت پیدا کرنے کے لیے فارسی محاورات وتراکیب کا اردو میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح شمالی ہند میں ۱۸۰۰ء تک ایک صاف ستھری، ادبی اور ٹکسالی زبان ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

شاہ حاتم اور میر وسودا کے زمانے میں اردو زبان میں جو اصلاحیں کی گئیں یا جن الفاظ کو متروک قرار دیا گیا ان کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان اصلاحات ومتروکات اور تراش وخراش کی پابندی یہ شعرا خود بھی پورے طور پر نہیں کرسکے۔ اس دور کے شعرار کے کلام کی چند لسانی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) ندائی حالت میں حرفِ ندا اے کے ساتھ فارسی جمع کا استعمال، مثلاً اے بتاں

(اے بتو!) اے عزیزاں (اے عزیزو!)، وغیرہ ؎

اے بتاں اس قدر جفا ہم پر عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم

(میر)

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں میرؔ کو تم عبث اداس کیا

(میر)

اے عزیزاں دکھا کے چہرہ و زلف رات جہرو نے مجھ کو نستارا

(ناجی)

(۲) اسی طرح حروف کا، کی، کو، کے، سے وغیرہ کے ساتھ بھی فارسی جمع کا استعمال؛ مثلاً بتاں کے (بتوں کے)، لباں کی (لبوں کی)، خوباں سے (خوبوں سے)، وغیرہ ؎

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار تھا

(میر)

ہزار قول کریں یہ نباہ کا سودا مجھے بتاں کی محبت کا اعتبار نہیں

(سودا)

اٹھ گیا دل کا مرے اب اعتبار یہ تو خوباں سے جہاں کے مل پھرا

(سودا)

(۳) ضمائر اُس، کِس اور جِس کی جگہ اُن، کِن اور جن کا استعمال، مثلاً اُن نے (اُس نے)، کِن نے (کِس نے)، جن نے (جس نے)، وغیرہ ؎

اُن نے دیکھا جو اُٹھ کے سوتے سے اُڑ گئے آئینے کے توتے سے

(میر)

شکلیں کیا کیا ہیں جن نے خاک یہ وہی آسمان ہے پیارے

(میر)

Scanned by CamScanner

اُن نے کہا یہ مجھ سے اب چھوڑ دخترِ رز کو     پیری میں اے دوانے یہ کون مستیاں ہیں

(سودا)

(۴) وہ کی جمع وے کا استعمال، مثلاً ؎

وے صورتیں الٰہی کس مُلک بستیاں ہیں     اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

(سودا)

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھودیے     پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

(میر)

نہ وے زنجیر کے غل ہیں نہ وے جر گے غزالوں کے

مرے دیوان پن تک ہی رہا معمور ویرانا

(میر)

(۵) ضمائر کی اضافی حالت میرا اور تیرا کی جگہ مجھ اور تجھ کا استعمال، مثلاً

مجھ پاس (میرے پاس)، تجھ پاس (تیرے پاس)، تجھ بن (تیرے بن)، وغیرہ ؎

سحر گہ عید میں دورِ سبو تھا     پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

(میر)

تجھ بن عجب معاش ہے سودا کا ان دنوں     تو بھی ٹک اس کو جا کے ستمگار دیکھنا

(سودا)

میں نہ چاہوں گا کسی سے داد اپنے قتل کی     کس لیے تجھ ہاتھ سے پرواز کرتی ہے حنا

(سودا)

(۶) حالتِ اضافی میں ضمیر جمع حاضر اور ضمیر جمع متکلم کے آخر میں اں کا اضافہ اور ضمائر کا اسم کے بعد استعمال، مثلاً راتیں تمھاریاں (تمھاری راتیں)، باتیں ہماریاں (ہماری باتیں)، وغیرہ ؎

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

(میر)

(۷) فعلِ متعدی کے ساتھ علامتِ فاعلی نے کا استعمال ضروری نہ سمجھنا، مثلاً میں پوچھا (میں نے پوچھا)، میں دیکھا (میں نے دیکھا)، وغیرہ ؎

سودا سے یہ پوچھا میں، دل میں بھی کسی کو دوں وہ کر کے بیان اپنا رُوداد بہت رو یا

(سودا)

جس چشم نے مجھ طرف نظر کی اس چشم کو میں پُر آب دیکھا

(سودا)

میر سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

(میر)

(۸) ماضیِ مطلق کے صیغۂ جمع مونث میں فعلی مادے کے بعد یں / ئیں کی بجائے یاں / ئیاں کا استعمال، مثلاً چلیاں (چلیں) ہلیاں (ہلیں)، آئیاں (آئیں)، وغیرہ ؎

جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں
نہ چوبِ گُل نے دم مارا نہ جھڑیاں بید کی ہلیاں

(میر)

فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا مری آہ نے برچھیاں ماریاں

(میر)

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں

اسی طرح ماضی قریب میں آئی ہیں کی جگہ آئیاں ہیں، مثلاً ؎

سُن کر سو برس کی ناموسِ خامشی کھو دو چار دل کی باتیں اب منہ پہ آئیاں ہیں

(میر)

(۹) فعلِ حال کے صیغۂ جمع مونث میں فعلی مادے کے بعد تی کی بجائے تیاں کا استعمال مثلاً ترستیاں ہیں (ترستی ہیں)، برستیاں ہیں (برستی ہیں) ہنستیاں ہیں (ہنستی ہیں)، وغیرہ سے

برسات کا تو موسم کب کا نکل گیا پر مژگاں کی یہ گھٹائیں اب تک برستیاں ہیں

(سودا)

اسی طرح فعلِ حال کے صیغۂ جمع مذکر کے طور پر چلے ہیں (چلتے ہیں)، کھینچے ہیں (کھینچتے ہیں)، وغیرہ اور صیغۂ واحد کے طور پر چلے ہے (چلتا/چلتی ہے)، آئے ہے (آتا/آتی ہے)، جائے ہے (جاتا/جاتی ہے) کا استعمال سے

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

(میر)

چمکے ہے جب سے برقِ سحر گلستاں کے اور جی لگ رہا ہے خار و خس آشیاں کے اور

(میر)

اس کی طرزِ نگاہ مت پوچھو جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو

(میر)

(۱۰) ماضیِ مطلق، ماضیِ ناتمام، حال اور مستقبل کے صیغے بناتے وقت مصوتوں پر ختم ہونے والے فعلی مادوں کے بعد وے کا اضافہ مثلاً آوے (آئے)، کھاوے تھا (کھاتا تھا) لیوے ہے (لیتا ہے)، جاوے گا (جائے گا)، وغیرہ سے

دل سے بوئے کباب آوے ہے کوئی مستِ شراب آوے ہے

(حاتم)

نہ لاوے ترے حسن کی ماہ تاب ترا مکھ ہے سرچشمۂ آفتاب

(مضمون)

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے  اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے
(میر)

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا
(میر)

(۱۱) مصوتوں پر ختم ہونے والے فعلی مادوں کے آخر میں ئے کا اضافہ کر کے ماضیِ معطوف بنانا، مثلاً ڈھائے کر (ڈھاکر)، لائے کر (لاکر)، گائے کر (گاکر)، وغیرہ

(۱۲) متعلقاتِ فعل میں جد (جب)، تد (تب)، کد (کب)، آگوں (آگے) اور ایدھر (ادھر)، اودھر (ادھر)، جیدھر (جدھر)، کیدھر (کدھر) وغیرہ کا استعمال۔ اسی طرح ندان (ہمیشہ)، ٹک (ذرا)، تنک (تھوڑا)، نپٹ (بالکل)، کنے (پاس)، کبھو (کبھی) وغیرہ کا استعمال۔

(۱۳) حروف میں نیں (نے)، کوں (کو)، لگ (تک)، سوں، سیں، سیتی (سے) وغیرہ کا استعمال، مثلاً ؎

نین سیں نین جب ملائے گیا  دل کے اندر مرے سمائے گیا
(آبرو)

دل غم سے کر کے لوہو، لوہو کا کر کے پانی  آنکھوں سیتی بہایا تب آبرو کہایا
(آبرو)

آیۂ رحمت ہے خط اوس مصحفِ رخسار پر  جنے دیکھا اک نظر سوں ناجیِ مطلق ہوا
(ناجی)

ذکر ہر صبح و شام ہے تیرا  وردِ عاشق کوں نام ہے تیرا
(ناجی)

(۱۴) جب دو الفاظ ساتھ آئیں تو حرفِ اضافت کا لانا ضروری نہ سمجھنا، مثلاً دل ساتھ (دل کے ساتھ)، دوش اوپر (دوش کے اوپر)، پالکی آگے (پالکی کے آگے) وغیرہ۔

(۱۵) بعض الفاظ میں مختصر مصوتوں کی بجائے طویل مصوتوں کا استعمال، مثلاً لوہو (لہو)، جاگہ (جگہ)، لاگا (لگا)، ماٹی (مٹی) وغیرہ سے

یارسائی اور جوانی کیوں کہ ہو ایک جاگہ آگ پانی کیوں کہ ہو

(یکرنگ)

مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا کہ پیراہن میں سو جاگہ رفو تھا

(میر)

کیا کہیں میر جی ہم تم سے معاش اپنی غرض غم کو کھایا کریں ہیں لوہو پیا کرتے ہیں

(میر)

دنیا تمام گردشِ افلاک سے بنی ماٹی ہزار رنگ کی اس چاک سے بنی

(سودا)

(۱۶) ایسے الفاظ کا استعمال جو آج کی اردو میں بالکل متروک ہو چکے ہیں، مثلاً یون (ہوا)، مکھ (منہ)، نمط (مانند)، پرے (الگ)، نت (ہمیشہ)، ٹھانو (جگہ)، بہت (بہت)، آگو (آگے)، ٹک (ذرا)، تیں (تو)، جگ (دنیا)، نداں (ہمیشہ)، کبھو (کبھی)، کسو (کسی)، وغیرہ۔

(۱۷) آج کی اردو کے برخلاف سیر، دید، جان، سطح، خلش، وغیرہ الفاظ کا بہ طورِ مذکر اور خواب، مزار، حشر، نشتر، وغیرہ الفاظ کا بہ طورِ مونث استعمال۔

(۱۸) اگر کسی جملے میں موصوف جمع مونث ہے تو صفت کا بھی جمع مونث لانا، مثلاً بھاریاں بیڑیاں (بھاری بیڑیاں)، کڑیاں ساعتیں (کڑی ساعتیں)، راتیں اندھیریاں (اندھیری راتیں)۔

(۱۹) ایک لفظ ہندی اور ایک لفظ فارسی یا عربی ملا کر مرکب اضافی بنانا، مثلاً صاحبِ ارتھی، پوشش چھینٹ، مانندِ آرسی وغیرہ۔

(۲۰) دونوں ہندی الفاظ یا ایک ہندی لفظ اور ایک فارسی لفظ کے درمیان واوِ عطف کا استعمال، مثلاً پھل و پھول، گل و بوٹا وغیرہ، ؎

چمن دل میں عشق بویا تھا داغ و شعلہ ہوا گل و بوٹا

(سودا)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اردو زبان کا دورِ قدیم تیرھویں صدی سے لے کر سترھویں صدی عیسوی تک قائم رہتا ہے، لیکن دورِ جدید انیسویں صدی سے پہلے شروع نہیں ہوتا۔ اِس طرح اٹھارہویں صدی کا دور اپنی مخصوص لسانی خصوصیات کی بنا پر ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ قدیم اردو کے اختتام (۱۷۰۰ء) اور جدید اردو کے آغاز (۱۸۰۰ء) کے درمیان کی اردو کو جو پوری اٹھارہویں صدی پر محیط ہے، درمیانی اردو قرار دے کر، جدید دور کی ابتدا ہم انیسویں صدی کے آغاز سے مان سکتے ہیں، اور فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کو جدید اردو کا اوّلین نقش تسلیم کر سکتے ہیں۔

# حواشی

۱۔ سُنیتی کمار چیٹرجی، انڈو آرین اینڈ ہندی (کلکتہ: فرما کے۔ ایل۔ مکھو پادھیائے، ۱۹۶۹ء)، ص ۱۰۳، [طبعِ اوّل ۱۹۴۲ء]

۲۔ ہارون خاں شیروانی (وفات ۱۹۸۰ء) نے اپنی تصنیف دکن کے بہمنی سلاطین (انگریزی) کے چودھویں باب، "لسانیاتی رجحانات" میں دکن میں اردو کے آغاز و ارتقا سے بھی

مختصراً بحث کی ہے۔ انھوں نے 'پروٹو اردو' کی اصطلاح دکھنی اور ابتدائی اردو کے لیے استعمال کی ہے جو میرے خیال میں صحیح نہیں ہے وہ لکھتے ہیں:

"دکھن میں بہمنیوں کے عروج ہی کے زمانہ میں ہند میں آرین زبانوں کا اختلاط ہوا۔ ایک طرف فارسی، مراٹھی اور دکھنی یا پروٹو اردو اور دوسری طرف ڈراوڑی زبانیں کنڑی اور تلنگی۔"

(ص ۳۲۳)

وہ مزید لکھتے ہیں:

"اردو جس نے آگے چل کر عظیم کل ہند عروج حاصل کیا اس کی ابتدائی شکل بہمنیوں کے عہد میں دکھنی یا پروٹو اردو تھی۔"

(ص ۳۲۶)

دیکھیے ہارون خاں شیروانی، دکن کے بہمنی سلاطین، مترجمہ رحم علی الہاشمی (نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، ۱۹۷۸ء)، ص ۳۲۳ اور ۳۲۶، اصل کتاب:

BAHAMANIS OF DECCAN

۳۔ مسعود حسین خاں، مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو (علی گڑھ: سرسید بک ڈپو، ۱۹۷۰ء)، ص ۱۱۴ [طبع اول ۱۹۴۸ء۔]

۴۔ سُنیتی کمار چیٹرجی، تصنیفِ مذکورہ، ص ۱۸۲۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۸۳۔

۶۔ محمد عوفی، لباب الالباب، مرتبۂ سعید نفیسی، ایرانی ایڈیشن (کتاب خانۂ ابنِ سینا)، ص ۴۲۳۔

۷۔ بہ حوالۂ شوکت سبزواری، داستانِ زبانِ اردو (دہلی: چمن بک ڈپو، س ن) ص ۱۰۶، [طبع اول ۱۹۶۱ء]

---

؎ پروٹو اردو (ابتدائی اردو)۔

۸ ۔ برج رتن داس، کھڑی بولی ہندی ساہتیہ کا اِتہاس (ہندی)، طبعِ دوم (وارانسی: ہندی ساہتیہ کُٹیر، ۲۰۰۹ س)، ص ۴۸ ۔ ۶۲ ۔

۹ ۔ ایضاً

۱۰ ۔ ایضاً ۔

۱۱ ۔ ایضاً ۔

۱۲ ۔ دیکھیے مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاے کرام کا کام (علی گڑھ: انجمن ترقیِ اردو (ہند)، ۱۹۶۸ء)

۱۳ ۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۱۱ ۔

۱۴ ۔ بہ حوالہ حافظ محمود خاں شیرانی، پنجاب میں اردو (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو ۱۹۷۰ء)، ص ۲۵۶، طبعِ اوّل ۱۹۲۸ء

۱۵ ۔ حافظ محمود شیرانی، تصنیفِ مذکورہ، ص ۲۵۷ ۔

۱۶ ۔ بہ حوالہ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلدِ اوّل (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۷ء)، ص ۳۸ ۔

۱۷ ۔ اِن الفاظ کے لیے دیکھیے مقالاتِ حافظ محمود خاں شیرانی، جلدِ اوّل (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۶ء)، ص ۶۲—۷۳ ۔ بہ حوالہ جمیل جالبی، تصنیفِ مذکورہ، ص ۲۴ ۔

۱۸ ۔ مسعود حسین خاں، تصنیفِ مذکورہ، ص ۱۳۲

۱۹ ۔ ایضاً، ص ۱۳۷ ۔

۲۰ ۔ جمیل جالبی، تصنیفِ مذکورہ، ص ۲۷

۲۱ ۔ مسعود حسین خاں، تصنیفِ مذکورہ، ص ۱۴۱

۲۲ ۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۱۴۳

۲۳ ۔ بہ حوالہ جمیل جالبی، تصنیفِ مذکورہ، ص ۴۳

۲۴ - مسعود حسین خاں، تصنیفِ مذکورہ، ص ۱۴۹۔

۲۵ - ایضاً، ص ۱۵۰۔

۲۶ - ایضاً۔

۲۷ - ایضاً، ص ۱۵۲۔

۲۸ - بہ حوالۂ مسعود حسین خاں، تصنیفِ مذکورہ، ص ۱۵۲۔

۲۹ - بہ حوالۂ جمیل جالبی، تصنیفِ مذکورہ، ص ۷۴۔

۳۰ - بکٹ کہانی (محمد افضل افضل)، مرتبہ نورالحسن ہاشمی اور مسعود حسین خاں، طبعِ ثانی (لکھنؤ: ادارۂ فروغِ اردو، ۱۹۷۰ء)۔

۳۱ - مسعود حسین خاں، "مقدمہ" بکٹ کہانی، ص ۲۱۔

۳۲ - دیکھیے تنویر احمد علوی، "افضل اور ان کا وطن"، نوائے ادب (بمبئی)، جلد ۲۰، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۶۹ء۔

۳۳ - مسعود حسین خاں، "مقدمہ" بکٹ کہانی، ص ۱۸۔

۳۴ - بکٹ کہانی کی لسانیاتی خصوصیات کے لیے دیکھیے مسعود حسین خاں، "مقدمہ" بکٹ کہانی، ص ۲۳-۲۵۔

۳۵ - مسعود حسین خاں، "مقدمہ" بکٹ کہانی، ص ۱۷۔

۳۶ - عاشور نامہ (روشن علی)، مرتبہ مسعود حسین خاں اور سید سفارش حسین رضوی (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء)۔

۳۷ - عاشور نامہ کے مرتب و مقدمہ نگار پروفیسر مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ "سہارنگ پور" موجودہ سہارن پور ہے۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کو اس امر سے اختلاف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سہارنگ پور سہارن پور نہیں ہے، بلکہ یہ مالوہ کے علاقے کا

شہر سہارنگ پور ہے جو اجین اور بھوپال سے قریب ہے اور
جہاں روشن علی نے اقامت اختیار کی تھی۔"

دیکھیے جمیل جالبی، "تاریخِ ادبِ اردو، جلد دوم، حصۂ اوّل (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۴ء) ص ۶۰۴۔

اس ضمن میں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ سہارنگ پور نام کی مالوہ کے قریب کوئی جگہ نہیں ہے جس جگہ کو ڈاکٹر جالبی سہارنگ پور بتاتے ہیں، وہ دراصل سارنگ پور ہے جو ریاستِ مالوہ کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے۔ یہ مقام اب مدھیہ پردیش میں واقع ہے اور آج بھی اپنے اسی پرانے نام سارنگ پور سے معروف ہے۔ اس کا ذکر آکسفرڈ اٹلس برائے ہندوستان اور سیلون کے گزیٹیر (مطبوعہ ۱۹۵۳ء) میں بھی ملتا ہے۔ قدیم تصانیف میں بھی سارنگ پور کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے متعلق یہاں تین حوالہ جات پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) مآثرِ محمود شاہی میں جو مالوہ کی قدیم ترین تاریخ ہے "سارنگ پور" کا ذکر دس مقامات پر آیا ہے۔ سارنگ پور میں ایک قلعہ بھی ہے جسے پہلی بار ہوشنگ شاہ نے فتح کیا تھا۔ مآثرِ محمود شاہی حکیم شہابؔ کی فارسی تصنیف ہے جس کا سنہ تصنیف ۸۷۲ھ مطابق ۶۸/۱۴۶۷ء ہے اور جسے ڈاکٹر نورالحسن انصاری نے مرتّب کر کے دہلی سے شائع کیا ہے۔

(۲) سارنگ پور کا ذکر شیر شاہ کے سلسلے میں بھی آیا ہے۔ جناب غلام یزدانی اپنی تصنیف مانڈو (شادی آباد) میں لکھتے ہیں:

"شیر شاہ نے جو دہلی کا بادشاہ ہوا تھا مانڈو پر حملہ کیا۔ قادر شاہ یہ دیکھ کر کہ فوج کے مقابلہ کرنے کی قوت اس میں نہیں ہے شیر شاہ کے رحم کا خواستگار ہوا، لیکن شیر شاہ نے اپنے وزیر اور عزیز شجاع خاں کو بحیثیت حاکم کے مقرر کیا اور وہ علاقہ جو اجین اور سارنگ پور کے چاروں طرف ہے اس کے سپرد کیا۔"

دیکھیے غلام یزدانی، مانڈو (شادی آباد) دہلی: انجمن ترقیِ اردو (ہند)، ۱۹۴۲ء، ص ۳۰۔

(۳) ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ سارنگ پور کا ذکر ملا داؤد کی تصنیف چنداین میں بھی موجود ہے جس کا سنِ تصنیف ۷۹ھ مطابق ۱۳۷۷/۸۰ء ہے۔ لورک چنداین کا ہیرو ہے۔ وہ چاندا کو اپنے ساتھ لے کر گنگا پار کرتا ہے اور پھر شہر سارنگ پور پہنچتا ہے۔

اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ عاشور نامہ کا مصنف روشن علی جس "سہارنگ پور" کا ذکر اپنی تصنیف میں کرتا ہے اور جہاں "سیرِ دنیا" کرنے کے بعد وہ سکونت پذیر ہوتا ہے، وہ سارنگ پور نہیں کوئی اور مقام ہو سکتا ہے جس کی تحقیق ضروری ہے۔ مالوہ کے قریب کے سارنگ پور کو سہارنگ پور سمجھ لینا اور اسے روشن علی کی جائے قیام قرار دینا سخت غلطی ہوگی، یہ عین ممکن ہے کہ سہارنگ پور، سہارن پور ہی ہو اور جیسا کہ پروفیسر مسعود حسین خاں نے تحریر فرمایا ہے، "رن" اور "رنگ" میں صوتیاتی تشابہ کی وجہ سے عوامی زبان میں سہارن پور، سہارنگ پور بن گیا ہو۔

۳۸۔ مسعود حسین خاں، "مقدمہ" عاشور نامہ، ص ۴۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۴

۴۰۔ ایضاً، ۲۳۔

۴۱۔ ان میں سے دس مرثیے راقم الحروف نے اپنے ایک مختصر نوٹ کے ساتھ پہلی بار مجلہ ہندوستانی زبان میں شائع کرائے۔ دیکھیے ہندوستانی زبان (بمبئی)، جلد ۱۲، نمبر ۱-۲، جنوری-اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۲۹-۴۱۔ یہ مرثیے زیرِ نظر کتاب میں بھی شامل ہیں۔

۴۲۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب، "مراثیِ ریختہ۔ شمالی ہند کی قدیم ترین اردو نظمیں"، تحریر (دہلی)، نمبر ۱۶۔ بہ حوالہ مسعود حسین خاں، "مقدمہ" عاشور نامہ، ص ۳

۴۳۔ دیکھیے اردو کی دو قدیم مثنویاں (اسمٰعیل امروہوی)، مرتبۂ نائب حسین نقوی (لکھنؤ: دانش محل، ۱۹۷۰ء)۔

۴۴۔ مسعود حسین خاں، " اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ"، فکر و نظر (علی گڑھ)، جلد ۹، شمارہ ۳، ۱۹۶۹ء، ص ۱۵-۱۶۔

۴۵۔ خالق باری کے مختلف نسخے پائے جاتے ہیں۔ حافظ محمود خاں شیرانی نے ان نسخوں کی مدد سے ایک قابلِ اعتماد متن تیار کیا اور اپنے دو گراں قدر دیباچوں کے ساتھ اسے انجمن ترقیِ اردو (ہند) دہلی سے ۱۹۴۴ء میں پہلی بار شائع کیا۔

۴۶۔ ڈاکٹر جمیل جالبی خالق باری کو اب بھی امیر خسرو (۱۲۵۳۔ ۱۳۲۵ء) کی تصنیف سمجھتے ہیں، دیکھیے جمیل جالبی، تاریخِ ادبِ اردو، جلد اوّل (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۷ء)، ص ۲۸۔

۴۷۔ دیکھیے اس منظوم لغت کے بارے میں راقم الحروف کا تفصیلی مضمون "خالق باری اور مثلِ خالق باری" مشمولہ ہفت روزہ ہماری زبان (علی گڑھ)، شمارہ ۱۵ مئی ۱۹۷۳ء۔

۴۸۔ "نہ صد و شصت" یعنی ۹۶۰ھ مطابق ۱۵۵۲/۵۳ عیسوی۔

۴۹۔ دیکھیے انجمن ترقیِ اردو (پاکستان)، کراچی کے سہ ماہی مجلّے اردو میں مثلِ خالق باری سے متعلق مولوی عبدالحق کا مضمون۔

۵۰۔ حافظ محمود شیرانی، "دیباچۂ اوّل" خالق باری، ص ۷۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۸۔

۵۲۔ بہ حوالہ جمیل جالبی، تصنیفِ مذکورہ، ص ۸۰۔

۵۳۔ چندر بلی پانڈے، مغل بادشاہوں کی ہندی (کاشی: ناگری پرچارنی سبھا)، ص ۱۵۔

۵۴۔ سُنیتی کمار چیٹرجی، تصنیفِ مذکورہ، ص ۲۰۰۔

۵۵۔ بہ حوالہ جمیل جالبی، تصنیفِ مذکورہ، ص ۶۱۔

۵۶ - ایضاً، ص ۷ -

۵۷ - پنڈت چندر بھان برہمن کی یہ غزل پروفیسر مسعود حسین خاں نے مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو (ص ۱۶۵) میں نقل کی ہے جس کا ماخذ کیفیہ (پنڈت دتاتریہ کیفی) ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی یہی غزل اپنی تاریخِ ادب اردو جلد اوّل (ص ۲۷) میں نقل کی ہے جس کا ماخذ بیاضِ قدیم (انجمن ترقیٔ اردو، پاکستان، کراچی) ہے

۵۸ - دیکھیے نعیم احمد، "میر جعفر زٹلی — ایک مطالعہ" مشمولہ تحریر (دہلی)، جلد ۲، شمارہ ۲، ۱۹۶۷ء -

۵۹ - دیکھیے فائز دہلوی اور دیوانِ فائز، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب (علی گڑھ: انجمن ترقیٔ اردو ہند)، ۱۹۶۵ء)، [طبعِ اوّل ۱۹۴۶ء]

۶۰ - کربل کتھا (فضل علی فضلی)، مرتبہ مالک رام اور مختار الدین احمد (پٹنہ: ادارۂ تحقیقاتِ اردو، ۱۹۶۵ء) -

۶۱ - ایضاً، "مقدمہ" -

۶۲ - قصۂ مہر افروز و دلبر (عیسوی خاں بہادر)، مرتبہ مسعود حسین خاں (حیدرآباد: شعبۂ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی، ۱۹۶۶ء) -

۶۳ - ایضاً، "مقدمہ"، ص ۲۴ -

۶۴ - دیکھیے مسعود حسن رضوی ادیب، "کرم علی: مرثیہ گو"، مشمولہ تحریر (دہلی)، جلد ۱، شمارہ ۱، ۱۹۶۷ء -

۶۵ - نوادر الالفاظ (خانِ آرزو)، مرتبہ سید عبداللہ (کراچی: انجمن ترقیٔ اردو (پاکستان)، ۱۹۵۱ء) -

(۱۹۷۶ء، نظرِ ثانی ۱۹۸۴ء)

# اردو کی معکوسی آوازیں
## اور
# اُن کا ارتقا

اٹھارویں صدی کے اختتام تک اردو کی موجودہ تمام آوازوں کا ارتقا عمل میں آچکا تھا۔ اردو آوازوں کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے مصوتی آوازیں اور مصمتی آوازیں ۔ اردو کی تمام مصوتی آوازیں وسطی ہند آریائی (پراکرت) سے ہوتی ہوئی قدیم ہند آریائی (سنسکرت) سے ارتقا پذیر ہوئی ہیں۔ اردو کی بیشتر مصمتی آوازوں کا ماخذ بھی قدیم ہند آریائی ہی ہے۔ اٹھارویں صدی کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے اُردو نے عربی فارسی کی بھی چند آوازیں مثلاً /ف ، ز ، ژ ، خ ، غ ، ق/ مکمل طور پر اپنالی تھیں[1]۔ ان کے علاوہ اردو کے ارتقا کے دوران اردو کی دو اپنی آوازوں /ڑ/ اور /ڑھ/ کا بھی ارتقا عمل میں آیا۔ چند غیر ممیز آوازیں بھی اردو کے ارتقا کے دوران ارتقا پذیر ہوئیں، مثلاً /مھ ، نھ ، لھ ، رھ ، وھ

۔کھ /۔ اردو نے اپنے ارتقا کے کسی بھی دور میں سنسکرت کی معکوسی (کوز) انفی آواز /ڻ/ ण نہیں اپنائی ۔ کہا جاتا ہے کہ /ڻ/ کی آواز قدیم دکنی تصانیف میں خال خال پائی جاتی ہے لیکن شمالی ہند کی کسی بھی تصنیف میں اس کا وجود نہیں ملتا۔

اردو میں عربی کی مصمتی آوازوں مثلاً /ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع/ کا وجود نہیں پایا جاتا۔ اردو کے نظامِ ہجی میں ان کی حیثیت محض حرُوف کی ہے، چونکہ ان آوازوں کا تلفظ اردو میں ادا نہیں کیا جاتا، اس لیے پروفیسر مسعود حسین خاں نے انھیں صوتی نقطۂ نظر سے "مردہ لاشیں" کہا ہے، جسے اردو رسم خط اٹھائے ہوئے ہے۔ صرف اس لیے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے۔ قدیم اردو تصانیف میں ایسی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں جہاں ان حروف کا استعمال خارج اور غیر ضروری قرار دیا گیا ہے۔ عاشور نامہ میں "الودا" (الوداع)، "باد" (بعد)، کربل کتھا میں "ہوا" (حوا)، دیوانِ آبرو میں "عبس" (عبث)، "معرا" (معمّا)، "ہال" (حال) اور دیوانِ شاکر ناجی میں "سدا" (صدا) وغیرہ اس کی چند مثالیں ہیں۔

اردو میں مصمتی آوازوں کی مجموعی تعداد ۳۷ ہے۔ ان میں ہندی (ہند آریائی)، فارسی اور عربی آوازوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ ان آوازوں کو پروفیسر مسعود حسین خاں نے ذیل کے سات حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ خالص ہندی آوازیں: بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، کھ، گھ، ٹ، ڈ، ڑ، ڑھ

۲۔ خالص فارسی: ژ

۳۔ خالص عربی: ق

۴۔ ہندی فارسی مشترک: ب، پ، ت، ج، چ، د، ر، س، ش

ک، گ، ل، م، ن، و، ہ، ی

۵۔ ہندی عربی مشترک : ب، ت، ج، د، ر، س، ش، ک، ل، م، ن، و، ہ، ی

۶۔ فارسی عربی مشترک : ب، ت، ج، خ، د، ر، ز، س، ش، غ ف، ق، ک، ل، م، ن، و، ہ، ی

۷۔ ہندی فارسی عربی مشترک : ب، ت، ج، د، ر، س، ش، ک، ل، م، ن، و، ہ، ی

۲

جن آوازوں کا ارتقا خالص ہند آریائی سے ہوا ہے ان میں اردو کی سبھی معکوسی یا کوز آوازیں اور سبھی ہکار آوازیں شامل ہیں۔ اردو کی کوز آوازیں ۶ ہیں جن میں تین ہکار (ٹھ، ڈھ، ڑھ) اور تین غیر ہکار (ٹ، ڈ، ڑ) آوازیں شامل ہیں۔ معکوسی آوازوں کا سلسلہ دیسی زبانوں سے بھی جا ملتا ہے۔ دیسی زبانوں کا تعلق سنسکرت کے آغاز و ارتقا سے قبل کی دراوڈی اور آسٹرک زبانوں سے ہے۔ دیسی زبانوں کے الفاظ مثلاً پیٹ، کٹورا، کٹار، ڈھول، گھونٹ، گھاٹ وغیرہ اردو میں اس طرح گھُل مِل گئے ہیں کہ یہ ہرگز گمان نہیں ہوتا کہ ان کی تاریخ کئی ہزار سال پرانی ہے۔

اردو میں کوز آوازوں کے حسب ذیل اقلی جوڑے پائے جاتے ہیں:

۱۔ /ٹ : ڈ/ ٹال : ڈال

۲۔ /ٹ : ٹھ/ ٹاٹ : ٹھاٹ ؛ پیٹ : پیٹھ

۳۔ / ڈ : ڈھ/ ڈال : ڈھال ؛ ڈور : ڈھور

۴۔ /ڑ : ڑھ/ باڑ : باڑھ ؛ بڑا : بڑھا

۵۔ /ت : ٹ/ تال : ٹال ؛ بات : باٹ

۶۔ /تھ : ٹھ/ ساتھ : ساٹھ

۷۔ /د : ڈ/ در : ڈر

۸۔ /دھ : ڈھ/ دھونا : ڈھونا

۹۔ /ر : ڑ/ دھر : دھڑ

اردو میں /ڑ/ اور /ڑھ/ کی آوازیں لفظ کی ابتدائی حالتوں میں نہیں پائی جاتیں یعنی اردو کا کوئی بھی لفظ /ڑ/ یا /ڑھ/ سے شروع نہیں ہوتا۔ /ڑ/ کی مشدّد صورت بھی اردو میں نہیں پائی جاتی۔ /ڑ/ اور /ڑھ/ کی آوازیں دوسری کو ز آوازوں /ڈ/ اور /ڈھ/ کے ساتھ بدل جاتی ہیں، مثلاً اڑیا اور اڈیا (عاشورنامہ) یا بوڑھا اور بوڈھا (کربل کتھا) وغیرہ۔ جدید اردو میں بھی یہ تبدیلی عام ہے، مثلاً علی گڑھ اور علی گڈھ، ہتھوڑی اور ہتھوڈی وغیرہ۔ لفظ کی درمیانی اور آخری حالتوں میں /ڈ/ کی آواز انفیائے گئے مصوتوں اور انفی مصمتوں کے بعد آتی ہے، مثلاً ہانڈی، سانڈ، لسونڈ، جھنڈا، ٹھنڈا وغیرہ۔ /ڈ/ اور /ڈھ/ کی آوازیں لفظ کے شروع میں آتی ہیں مثلاً ڈال، ڈھال، ڈور، ڈھور وغیرہ۔ چند ہندی نژاد الفاظ، مثلاً جڈا اور کھڈ وغیرہ میں /ڈ/ کی آواز آخر میں بھی آتی ہے۔ /ڈ/ کی آواز جب درمیانی حالت میں آتی ہے تو مشدّد ہو جاتی ہے، مثلاً ہڈّی، گدّی، اڈّا وغیرہ

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اردو کی بیشتر آوازوں کا ارتقا قدیم ہند آریائی ماخذ سے ہوا ہے۔ قدیم ہند آریائی سے یہ آوازیں وسطی ہند آریائی میں داخل ہوئیں اور جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کے دوران اردو میں داخل ہو گئیں۔ ان میں سے بہت سی آوازیں صوتی تبدیلیوں کے عمل سے بھی گذری ہیں۔

قدیم ہند آریائی دور - ۱۵۰۰ ق م تا ۵۰۰ ق م تسلیم کیا گیا ہے۔ اس دور

میں ویدک سنسکرت اور کلاسیکی سنسکرت کا ارتقا ہوا۔ ہندوستان کی قدیم ترین تصنیف رگ وید اور دیگر ویدوں کی تخلیق اسی دور میں عمل میں آئی۔ جب آریوں کا عمل دخل شمال مغربی ہندوستان سے لے کر ملک کے وسطی اور مشرقی خطے کی جانب بڑھنے لگا تو اس کا اثر آریوں کی زبان پر بھی پڑا اور ان کی زبان، سنسکرت کی مرکزی حیثیت ختم ہونے لگی۔ اس صورتِ حال اور لسانی انتشار سے متاثر ہو کر اس دور کے مشہور عالم اور قواعد نویس پانِنی نے اَشٹادھیائی لکھی جو آج بھی سنسکرت زبان کی ایک نہایت جامع اور مستند قواعد تسلیم کی جاتی ہے۔

قدیم ہند آریائی دور کے بعد وسطی ہند آریائی دور شروع ہوتا ہے جو ۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ عیسوی قائم رہتا ہے۔ اس دور کے ابتدائی عہد میں پالی اور اشوک کے کتبوں کی زبانوں کے نمونے ملتے ہیں۔ اس کے درمیانی عہد میں پانچ ادبی پراکرتیں، مہاراشٹری، شورسینی، ماگدھی، اردھ ماگدھی اور پیشاچی ظہور پذیر ہوتی ہیں اور آخری عہد میں ان پراکرتوں کے زوال کے بعد انھیں علاقوں میں مختلف اپ بھرنشیں پیدا ہوتی ہیں۔ اردو کا تعلق شورسینی اپ بھرنش اور اس کے توسط سے شورسینی پراکرت سے ہے۔

سنسکرت کے زوال کے بعد سنسکرت کے بے شمار الفاظ جنھیں 'تت سم' الفاظ کہتے ہیں مختلف صوتی تبدیلیوں سے گذر کر پراکرت میں داخل ہوئے اور پراکرت سے ہوتے ہوئے اپ بھرنش میں آ گئے۔ ۱۰۰۰ عیسوی کے بعد جب ہند آریائی زبانوں کے آغاز و ارتقا کا سلسلہ شروع ہوا تو یہی الفاظ مزید صوتی تبدیلیوں کے بعد اردو اور دیگر جدید ہند آریائی زبانوں میں داخل ہو گئے۔

## ۳

ذیل میں اردو کی معکوسی آوازوں /ٹ، ڈ، ڑ/ اور /ٹھ، ڈھ، ڑھ/ کا تاریخی ارتقا بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ معکوسی آواز /ٹ/ کا ارتقا:

| | قدیم ہند آریائی (سنسکرت) | وسطی ہند آریائی (پراکرت) | جدید ہند آریائی (اردو) |
|---|---|---|---|
| **ابتدائی /ٹ/:** | | | |
| (۱) | ت ر | ٹّ | ٹ |
| | تُرُٹَ | ٹُٹّ | ٹوٹ |
| **درمیانی /ٹ/:** | | | |
| (۱) | ٹ | ٹ | ٹ |
| | کَنْٹک | کَنٹَ آ | کانٹا |
| (۲) | رت | ٹّ | ٹ |
| | اَرْتَ | اَٹّ آ | آٹا |
| (۳) | تّ | ٹّ | ٹّ |
| | مرتکا | مٹّ آ | مٹّی |
| **آخری /ٹ/:** | | | |
| (۱) | شٹ ر | ٹّ | ٹ |
| | اُشٹر | اُٹّ | اونٹ |
| (۲) | شٹ | ٹّ | ٹ |
| | اِشٹَ | اِٹّ | اینٹ |
| (۳) | شٹھ | ٹھّ | ٹ |
| | اوشٹھ | اوٹّھ | ہونٹ |

## ۲۔ معکوسی آواز /ٹھ/ کا ارتقا:

| | قدیم ہند آریائی (سنسکرت) | وسطی ہند آریائی (پراکرت) | جدید ہند آریائی (اردو) |
|---|---|---|---|
| **ابتدائی /ٹھ/:** | | | |
| (۱) | ٹھ | ٹھ | ٹھ |
| | شٹھگ | ٹھگ | ٹھگ |
| **درمیانی /ٹھ/:** | | | |
| (۱) | ش ٹھ | ٹّھ | ٹھ |
| | مِشٹھ | مِٹّھ | میٹھا |
| | انگشٹھ | انگٹّھ | انگوٹھا |
| **آخری /ٹھ/:** | | | |
| (۱) | ش ٹ | | |
| | اشٹ | اٹّھ | آٹھ |
| (۲) | ش ٹھ | ٹّھ | ٹھ |
| | پرشٹھ | پٹّھ | پیٹھ |

## ۳۔ معکوسی آواز /ڈ/ کا ارتقا:

| | قدیم ہند آریائی (سنسکرت) | وسطی ہند آریائی (پراکرت) | جدید ہند آریائی (اردو) |
|---|---|---|---|
| **ابتدائی /ڈ/:** | | | |
| | ڈ | ڈ | ڈ |
| | ڈولکا | ڈولیا | ڈولی |

| | | |
|---|---|---|
| ڈاکنی | ڈائِن | ڈائن |
| ڈَرَ | ڈَرَ | ڈَرد |

درمیانی /ڈ/:

| | | |
|---|---|---|
| (۱) ڈ | ڈ | ڈ |
| اَنڈکَ | انڈاَ | انڈا |

## ۴۔ معکوسی آواز /ڈھ/ کا ارتقا:

| قدیم ہند آریائی (سنسکرت) | وسطی ہند آریائی (پراکرت) | جدید ہند آریائی (اردو) |
|---|---|---|

ابتدائی /ڈھ/:

| | | |
|---|---|---|
| (۱) — | ڈھ | ڈھ |
| — | ڈھَنکنی | ڈھکنی |

درمیانی /ڈھ/:

| | | |
|---|---|---|
| (۱) رِدّھ | ڈھ | ڈھ |
| وِردّھَ | بُڈّھَ | بُڈّھا (بوڑھا) |

## ۵۔ معکوسی آواز /ڑ/ کا ارتقا:

| قدیم ہند آریائی (سنسکرت) | وسطی ہند آریائی (پراکرت) | جدید ہند آریائی (اردو) |
|---|---|---|

درمیانی /ڑ/:

| | | |
|---|---|---|
| (۱) ٹ | ڈ | ڑ |
| گھوٹکَ | گھوڈاَ | گھوڑا |
| کیٹَ | کیڈَ | کیڑا |

| | | |
|---|---|---|
| جوٗٹک | جوٗڈا | جوٗڑا |
| مرکٹکا | مکڈا | مکڑی |

### ۶۔ معکوسی آواز /ڑھ/ کا ارتقا:

| قدیم ہند آریائی (سنسکرت) | وسطی ہند آریائی (پراکرت) | جدید ہند آریائی (اردو) |
|---|---|---|

درمیانی /ڑھ/ :

| | | | |
|---|---|---|---|
| (۱) | ردھ | ڈھ | ڑھ |
| | وردھاکن | بڈھکا | بڑھئی |
| (۲) | ردھ | ڈھ | ڑھ |
| | وردھ | بڈھ | بوڑھا |

آخری /ڑھ/ :

| | | | |
|---|---|---|---|
| (۱) | ردھ | ڈھ | ڑھ |
| | دوِاردھ | دِاڈھ | ڈیڑھ |
| (۲) | ڈھ | ڈھ | ڑھ |
| | اَشاڈھ | اَساڑھ | اَساڑھ |

۴

اردو کی معکوسی آوازوں کے ارتقا کا جو جائزہ اوپر پیش کیا گیا ہے اس سے حسبِ ذیل نتائج مرتب ہوتے ہیں:

۱۔ اردو میں /ٹ/ کی آواز کا ارتقا پراکرت کی ٹ، مشدد ٹ، مشدد ٹھ اور سنسکرت کی ٹ مضمنی خوشوں ت ر، رت، ش ٹ، ش ٹھ، ش ٹ ر اور مشدد ت سے ہوا ہے۔

۲۔ اردو میں /ٹھ/ کی آواز کا ارتقا پراکرت کی ٹ، ٹھ، مشدّد ٹھّ اور سنسکرت کی ٹھ، مصمتی خوشے شٹ اور شٹھ سے ہوا ہے۔

۳۔ اردو میں /ڈ/ کی آواز کا ارتقا پراکرت اور سنسکرت کی ڈ سے ہوا ہے۔

۴۔ اردو /ڈھ/ کی آواز کا ارتقا پراکرت ڈھ اور سنسکرت ڈھ اور رڈھ سے ہوا ہے۔

۵۔ /ڑ/ کی آواز پراکرت اور سنسکرت میں ناپید ہے۔ پراکرت میں /ڑ/ کی جگہ /ڈ/ پایا جاتا ہے /ڑ/ کا ارتقا پراکرتوں کے بعد عمل میں آیا۔ اردو کی یہ خالص اپنی آواز ہے۔ /ٹ، ٹھ/ اور /ڈ، ڈھ/ کی آوازیں پراکرت میں بھی پائی جاتی ہیں اور سنسکرت میں بھی، لیکن /ڑ/ کی آواز نہ تو سنسکرت میں ملتی ہے اور نہ پراکرت میں۔ اسی طرح /ڑھ/ کی آواز بھی ان زبانوں میں نہیں پائی جاتی۔ یہ بھی پراکرتوں کے بعد ارتقا پذیر ہونے والی آواز ہے۔ اردو میں /ڑ/ کی آواز کا ارتقا پراکرت کی /ڈ/ اور سنسکرت کی /ٹ/ سے ہوا ہے۔

۶۔ اسی طرح /ڑھ/ کی آواز پراکرت کی ڈھ اور مشدّد ڈھّ، اور سنسکرت کی ڈھ، ژدھ اور ردھ سے ارتقا پذیر ہوئی ہے۔

۷۔ پراکرت میں آوازوں کے مشدّد ہونے کا رجحان زیادہ ہے۔ اردو میں پراکرت کی مشدّد آوازیں، باستثنائے چند، مفرد آوازوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

۸۔ سنسکرت میں مصمتی خوشے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ سنسکرت کے مصمتی خوشے پراکرت میں آسان ہو کر مشدّد بن جاتے ہیں اور یہی مشدّد آوازیں اردو میں مفرد بن جاتی ہیں۔

۹۔ سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ عموماً مصوتوں پر ختم ہوتے ہیں، بالخصوص

مختصر مصوتے /اَ/ پر۔ اردو کا کوئی بھی ہندی نژاد لفظ مختصر مصوتے /اَ/ پر ختم نہیں ہوتا۔ سنسکرت اور پراکرت الفاظ کے آخر میں واقع ہونے والا مختصر مصوتہ /اَ/ اردو میں بالعموم طویل مصوتے /آ/ میں تبدیل ہو جاتا ہے، مثلاً اَنگُشٹھَ (سنسکرت): اَنگُٹّھَ (پراکرت) :۔ اَنگوٹھا (اردو)۔

# حواشی

۱۔ شمالی ہند اور دکن کی قدیم اردو تصانیف میں بعض الفاظ میں عربی فارسی آوازوں، مثلاً /ز/، /خ/، /غ/ وغیرہ کو بدل کر انھیں ہندی تلفظ سے ادا کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ایسی چند مثالیں یہ ہیں:

(۱) /ز/ کی /ج/ میں تبدیلی، مثلاً لرجا (لرزا) ؎

جھڑی پڑنے لگی اور رعد گرجا

تمامی تن بدن جیو جان لرجا

(بکٹ کہانی، شعر ۷۰)

۲۔ /غ/ کی /گ/ میں تبدیلی، مثلاً داگ (داغ) ؎

رہے ہیں پھول پھولوں کے گلے لاگ

مرے سینے جدائی کا لگا داگ

(بکٹ کہانی، شعر ۲۴۰)

سکھی! اگہن سیہ رو مانس آیا

سجن آئے نہ کاگد لکھ پٹھایا

(بکٹ کہانی، شعر ۱۲۳)

اسی طرح قطب مشتری (ملا وجہی) میں خالہ کا تلفظ "کھالا" اور بے ضد کا تلفظ "بجید" ملتا ہے۔

دکنی تصانیف میں /ق/ کو /خ/ میں تبدیل کرنے کا رجحان بھی عام ہے، مثلاً "اخل" (عقل)، "وخت" (وقت)، "واخا" (واقعہ)، وغیرہ۔

۲ ۔ مسعود حسین خاں، "اردو صوتیات کا خاکہ"، شعر و زبان (حیدرآباد، ۱۹۶۶ء) ص ۲۵۵۔

۳ ۔ ڈاکٹر بدیع حسینی معکوسی (کوز) آواز /ݨ/ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ابھی تک کسی محقق نے دکنی میں اس نون کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا ہے اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بھی لکھا ہے کہ "ݨ" کی آواز اردو نے اپنے ارتقا کے کسی دور میں نہیں اپنائی۔" ("اردو صوتیات کا خاکہ"، شعر و زبان، ص ۲۵۵) لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم دکنی میں یہ آواز موجود تھی۔ مخطوطوں میں کوزی آوازوں یعنی ٹ، ڈ، ڑ کے اظہار کے لیے ت، د، ر کے نیچے تین نقطے لگائے جاتے تھے، کیوں کہ ان حروف کی موجودہ صورت بعد کا ارتقا ہے۔ کوزی ن کے لیے بھی بعض مخطوطوں میں ن کے نیچے تین نقطے لگائے گئے ہیں اور مخطوطوں کی طرح شمائل الاتقیا میں بھی یہ نون ملتا ہے"

دیکھیے بدیع حسینی، "مقدمہ" شمائل الاتقیا (میراں یعقوب)، مشمولہ قدیم اردو، جلدِ دوم (۱۹۶۸ء)، مرتبہ مسعود حسین خاں (حیدرآباد، شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی)، ص ۱۶۵ - ۱۶۶۔

۴ ۔ مسعود حسین خاں، تصنیفِ مذکورہ، ۲۵۲۔

۵ ۔ ایضاً، ص ۲۵۰۔

(۱۹۸۰ء)

# سترھویں صدی کی اردو
## چند صوتیاتی خصوصیات

شمالی ہند میں اُردو کے آغاز وارتقا کی تاریخ یوں تو بارہویں صدی کے اختتام (۱۱۹۳ء) ہی سے شروع ہو جاتی ہے، لیکن اس زبان میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ سترھویں صدی کے ربعِ اوّل سے شروع ہوتا ہے۔ ہندوستان کے شمالی خطّۂ ارض میں تیرہویں، چودھویں، پندرھویں اور سولھویں صدی کے دوران اردو محض بول چال کی زبان تک محدود رہتی ہے۔ صوفیائے کرام کے ملفوظات اور امیر خسرو (۱۲۵۳ - ۱۳۲۵ء) کی شاعری سے قطع نظر اس پورے چارسو سال کے عرصے میں شمالی ہند میں اردو کی کوئی بھی تصنیف دستیاب نہیں ہوئی۔

شمالی ہند کا سب سے پہلا ادبی کارنامہ بکٹ کہانی[1] ہے جس کا دورِ تصنیف ۱۶۲۵ء سے قبل کا زمانہ تسلیم کیا گیا ہے کیوں کہ اس کے مصنف محمد افضل افضلؔ کا انتقال ۱۶۲۵ء میں ہوا۔ شمالی ہند میں دستیاب ہونے والی سترھویں صدی کی دوسری

اہم تصنیف واقعاتِ کربلا سے متعلق روشن علی کی ایک طویل نظم عاشور نامہ[۲۸] ہے جس کا سالِ تصنیف ۱۶۸۸ء ہے۔ قاسم، صلاح اور قربان علی کے مرثیے بھی غالباً اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں[۳۰]۔ سترہویں صدی کے اواخر کی ایک اور شعری تخلیق اسمٰعیل امروہوی کی وفات نامۂ بی بی فاطمہ ہے جس کا سالِ تصنیف ۱۶۹۳ ہے[۳۱]۔ سترہویں صدی ہی کی ایک اور تصنیف خالق باری[۳۲] ہے جو ۱۶۲۱ء میں لکھی گئی۔ یہ ایک منظوم لغت ہے جس کے مصنف ضیاء الدین خسرو ہیں۔ اگرچہ اس کی وہ اہمیت نہیں جو سترہویں صدی کی دوسری تصانیف کی ہے تاہم اس دور کی زبان، بالخصوص الفاظ کے تلفظ و املا کو سمجھنے میں اس سے کافی مدد ملتی ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ شمالی ہند میں سترھویں صدی کے دوران میں کسی اور تصنیف کا سُراغ نہیں ملتا۔

سترھویں صدی کے دوران میں نثر کی کوئی بھی تصنیف دستیاب نہیں ہوئی۔ شمالی ہند کا پہلا نثری کارنامہ کربل کتھا[۳۶] ہے جسے فضل علی فضلی نے ۳۳/۱۷۳۲ء میں مکمل کیا، لیکن اس کی حیثیت محض ترجمے کی ہے[۳۴]۔

اس مقالے میں شمالی ہند کی صرف انھیں صوتیاتی خصوصیات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جن کا تعلق سترھویں صدی سے ہے۔ یہ صوتیاتی خصوصیات حسبِ ذیل عنوانات کے تحت بیان کی جا سکتی ہیں۔

## ۱۔ ہکار اور غیر ہکار مصوتے

ھکار آوازیں اردو صوتیات کا اہم جزو ہیں۔ اُردو میں ان کی تعداد گیارہ ہے۔ مثلاً پھ، بھ، تھ، دھ، ٹھ، ڈھ، چھ، جھ، کھ، گھ اور ڑھ[۳۵]۔ سترھویں صدی کے دوران ان آوازوں کا ارتقا پوری طرح عمل میں آچکا تھا لیکن ان کے لکھنے میں بے اعتدالی کی عام روش پائی جاتی تھی، کہیں

انھیں دوچشمی 'ہے' (ھ) کے ساتھ لکھا جاتا تھا اور کہیں ہائے ہوّز (ہ) کے ساتھ۔ کہیں کہیں ہکاریت ہی کو ختم کر دیا جاتا تھا۔ پھ، بھ، تھ، دھ وغیرہ میں اگر ہکاریت کو ختم کر دیا جائے تو یہ آوازیں غیر ہکار آوازوں بالترتیب پ، ب، ت، د میں تبدیل ہو جائیں گی۔ سترھویں صدی کی اردو میں ایسے بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں جن میں ہکار آوازوں کی جگہ غیر ہکار اور غیر ہکار آوازوں کی جگہ ہکار آوازوں کا استعمال ہوا ہے۔

۱۔ ہکار آوازوں کی جگہ غیر ہکار آوازیں:

(۱) لک (لکھ، لاکھ):

سکھی یہ مانس تو لک مانس بتیا ۔۔۔ بدیسی شام نے پھیرا نہ کیتا

(رکبٹ کہانی، ص ۴۶)

(۲) باندے (باندھے):

انھوں نے مسلمانی کا چھوڑا دیں ۔۔۔ ظلم پر کمر باندے ہیں بے یقیں

(عاشور نامہ، ص ۱۰۰)

(۳) مُج (مجھ):

کروں مصطفیٰ سیتی میں کیا جواب ۔۔۔ علی، فاطمہ کا ہو مج پر عتاب

(عاشور نامہ، ص ۱۰۲)

(۴) دوُد (دودھ):

پانی بن مجھے دوُد آتا نہیں ۔۔۔ حلق خشک سے طفل بولتا نہیں

(عاشور نامہ، ص ۱۲۸)

(۵) کچاکچ (کھچا کھچ):

ابر چھا گئے نور کے جو بہوت ۔۔۔ کچاکچ بھریا نور میں تھا ثروت

(وفات نامۂ بی بی، ص ۹)

(۶) تج (تجھ):

کراے بی بی تج کون بشارت ہے خوب   حوراں تیرے لینے کھڑی ہیں انوب

(وفات نامۂ بی بی، ص ۱۲۲)

## ۲۔ غیر ہکار آوازوں کی جگہ ہکار آوازیں

(۱) ڈنکھ (ڈنک):

سرد سیلا گرم تتا چیرہ سخت   نرم کنولا نیش ڈنکھ اور نگ تخت

(خالق باری، ص ۷۰)

(۲) پالکھی (پالکی):

دولہ ہے ڈولی کہار ش دولہ کش   پالکھی معروف چھتری سایہ کش

(خالق باری، ص ۹۶)

(۳) پرگھٹ (پرکٹ بمعنی ظاہر):

قیامت کا سب پر ہوا یہ گماں   ہوا گرد سیتی ایک پرگھٹ جواں

(عاشور نامہ، ص ۱۴۱)

(۴) سکھینہ (سکینہ):

زین العابدین اور سکھینہ چلے   یزید سیتی جا کر محل میں ملے

(عاشور نامہ، ص ۱۴۸)

(۵) بیچھ (بیچ):

فکر بیچھ بیٹھی تھی سر ڈال کر   آئی چار زن نظر اس وقت پر

(وفات نامہ، ص ۱۰۸)

## ۲۔ تقلیبی ہکاریت

بعض الفاظ میں ہکاریت تقلیبِ صوت کی وجہ سے بھی پیدا ہو جاتی ہے، یعنی

/ ہ / کی آواز یا ہکاریت اپنے اصل مقام سے ہٹ کر اپنے ماقبل یا مابعد کی غیر ہکار مصمتی آواز میں مدغم ہو کر اسے ہکار بنا دیتی ہے۔ سترھویں صدی کی اردو میں اس کی بیشتر مثالیں ملتی ہیں۔

۱۔ /ہ/ کی تقلیب

(۱) پچھان (پہچان):

صعوہ سریچہ مولا جان کوّا زاغ کلاغ پچھان

(خالق باری، ص ۶۸)

(۲) بھیّاں (بہیاں):

کہ گھر جا برہنی کو گر لگاؤ پکڑ بھیّاں پلنگ اوپر بٹھاؤ

(بکٹ کہانی، ص ۴۲)

(۳) بھوت (بہت):

ظلم مجھ پر سکھی بھوت ہی کیا ہے جدائی کا ہمن کو غم دیا ہے

(بکٹ کہانی، ص ۴۹)

(۴) بھاں (یہاں):

گیا بھائی قاسم وہ جنت کے تئیں ہمیں بھاں تی چھوڑا ہے ذلّت کے تئیں

(عاشور نامہ، ص ۱۳۱)

۲۔ ہکاریت کی تقلیب

(۱) دوکھا (دھوکا):

طفل کو تو نے کیوں دوکھا دیا کہ دم میں مَیں نے اس کو یے جی کیا

(عاشور نامہ، ص ۱۸۵)

## ۳۔ بین مصوتی /ہ/ کا انخذاف

بعض الفاظ میں دو مصوتوں کے درمیان /ہ/ ہوتی ہے۔ ایسی /ہ/ بعض اوقات تلفظ میں نہیں آتی اور نہ لکھنے ہی میں آتی ہے، مثلاً

(۱) کاں (کہاں):

ارے اودھو! کہاں لگ دکھ کہوں رے ایسے مورکھ سیتی کاں لگ بکوں رے

(ریکٹ کہانی، ص ۵۷)

(۲) نئیں (نہیں):

کیا سجدہ سب نے پھیرا نے امر کیا نئیں عزازیل، حجّت پکڑ

(عاشور نامہ، ص ۴۳)

(۳) سپائی (سپاہی):

وہ تھا نام مشہور سب اوج میں سپائی وہ سالار تھا فوج میں

(عاشور نامہ، ص ۱۷۸)

## ۴۔ انفی اور غیر انفی مصوتے

مصوتوں کی انفیت اردو کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اردو کے موجودہ تمام مصوتے انفی کیے جا سکتے ہیں۔ سترھویں صدی کی اردو میں مصوتوں کی انفیت کا رجحان کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس دور کی تصانیف میں ایسی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں جن میں غیر انفی مصوتوں کو انفی بنا دیا گیا ہے۔

ا۔ غیر انفی مصوتوں کی جگہ انفی مصوتے

(۱) پونچھا (پوچھا):

پونچھا سوز سیتی اے دلبند من انی غم سے گریاں سوکیوں ہوتمن

(عاشور نامہ، ص ۴۴)

(۲) دیاں (دیا):

ہمیں خواب شب کو دیاں یوں رسول ہوئی ہے بشارت یہ ہم کو قبول

(عاشور نامہ، ص ۴۳)

(۳) نیں (نے):

فارغ نہیں ازیں الم و درد جن و انس جارا ہے اس اگن نیں دل خاص و عام کوں

(صلاح)

(۴) سیں (سے):

کہوں نعت اب میں محمد رسول دو عالم صدق دل سیں کیجو قبول

(وفات نامۂ بی بی، ص ۱۰۵)

۲۔ انفی مصوتوں کی جگہ غیر انفی مصوتے

غیر انفی مصوتوں کو انفی بنانے کے برعکس انفی مصوتوں کو غیر انفی بنانے کا رجحان بھی اس دور کی اردو کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ مثلاً

(۱) کوا (کنواں):

دروازہ پہ کوفے کے تھا اک شجر کوا پاس تھا اس کے اک نامور

(عاشور نامہ، ص ۸۷)

(۲) فرشتو (فرشتوں):

فرشتو نے دیکھا جو خالد گرا : یا حور نے لا کے پیالہ بھرا

(عاشور نامہ، ص ۷۱)

(۴) ما (ماں):

کسے ما کہیں گے وہی بول کر نہ مائی کوئی رہوے سر پے مگر

(وفات نامہ، ص ۱۲۰)

## ۵۔ مشدّد اور غیر مشدّد مصوتے

اُردو میں مشدّد مصمتوں کی تعداد کافی ہے، لیکن بعض ایسے مصمتے جو مشدّد نہیں ہیں سترھویں صدی کی اردو میں مشدّد کر دیے جاتے ہیں۔ اس دور میں نہ صرف درمیانی بلکہ آخری مصمتوں کو بھی مشدّد بنانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اسی طرح مشدّد کو غیر مشدّد بنانے کا رجحان بھی عام ہے۔

۱۔ غیر مشدّد سے مشدّد

(۱) اساڑّھ (اساڑھ):

سنو اساڑّھ ماس آیا سکھی ری کرم میرے نہ جانوں کیا لکھی رے

(بکٹ کہانی، ص ۶۲)

(۲) ہوّا (ہوا):

کتے روز گذرے بھتے اس بات کو یزید ہوّا قابض خلافت کو

(عاشور نامہ، ص ۵۴)

(۳) سبّ (سب):

ترے نور سے عرش و کرسی کیا شرف سبّ نبیوں کا تجکو دیا

(عاشور نامہ، ص ۳۵)

(۴) جگّہ (جگہ):

کروں ایسی جگّہ تمھارا مقام شب و روز در عیش گذرے مدام

(عاشور نامہ، ص ۶۰)

اس دور میں مصمتوں کو مشدّد بنانے کا رجحان ہندی الفاظ کے علاوہ عربی فارسی الفاظ میں بھی عام ہے، مثلاً

خوش افضّل ازیں مشکل کہانی کسو نے حدّ اس کی کچھ نہ جانی
(بکٹ کہانی، ص ۶۶)

وہ کد بانو سلاّم آکر کیا کمر کھولا اُن نے (وہ) جلدی سے آ
(عاشور نامہ، ص ۵۸)

دونوں ضدّ کرتے بنی کن گئے بحث اپنی دونو نے ظاہر کیے
(عاشور نامہ، ص ۶۸)

کری بات قبوّل یہ شاہ کی اچھی ہے یہ تدبیر دلخواہ کی
(عاشور نامہ، ص ۹۷)

اتنے میں اٹھا ایک غبّار بھی یکایک ہوا ابر اندھیار بھی
(عاشور نامہ، ص ۱۴۱)

۱۔ مشدّد سے غیر مشدّد

(۱) سچا (سچّا):

قضا اور قدرت یہ صادق سچا جو کچھ تو کرے گا مجھے وہ اچھا
(عاشور نامہ، ص ۳۶)

(۲) کچی (کچّی):

کچی نیند سیتی جگانا نہ خوب ہوا اتنے عرصے میں سورج غروب
(عاشور نامہ، ص ۸۶)

(۳) مکار (مکّار):

دغاباز کوئی وہ ہیں گے مکار نہاں خونخواری، عیاں غم گسار
(عاشور نامہ، ص ۹۰)

(۴) قصہ (قِصّہ):

قصہ پورا کیتا جو سُن کان دھر پڑھو کلمہ خوش ہوئے ہر وقت پر

(وفات نامۂ بی بی، ص ۱۴۱)

(۵) اَوَل (اوّل)

اَوَل کچھ نہ تھا جد، بنی جو کیے نبوّت کا چھتّر انوں سر دیے

(معجزۂ انار، ص ۱۴۸)

## ۶۔ اضافۂ صوت اور تخفیفِ صوت

اضافۂ صوت سے مراد وہ صوتی خصوصیت ہے جس میں مصمتی خوشے کو توڑ کر دونوں مصمتوں کے درمیان ایک مصوتے کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اسے ساکن کو متحرک کر دینا بھی کہتے ہیں۔ سترھویں صدی کی اردو میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ اس دور کی تصانیف میں نہ صرف ہندی بلکہ عربی و فارسی الفاظ میں بھی اضافۂ صوت کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس اس دور کی اردو میں تخفیفِ صوت یا متحرک کو ساکن میں تبدیل کر دینے کا رجحان بھی ملتا ہے۔

### ۱۔ اضافۂ صوت

(۱) ظُلَم (ظُلْم):

ظُلَم مجھ پر سکھی، بھوت ہی کیا ہے جدائی کا ہمن کو غم دیا ہے

(بکٹ کہانی، ص ۹۴)

(۲) صَبَر (صَبْر):

نمانی کوارے ٹک درس دیجو برہنی کا صَبَر سر پر نہ لیجو

(بکٹ کہانی، ص ۵۲)

(۳) نَظم (نَظْم):

سبب سب مفصّل کروں میں بیاں نَظَم ہندوی کر کے بوجھے جہاں

(عاشورنامہ، ص ۳۶)

(۴) حَشَر (حَشْر):

خلق چودہ طبقاں کے ماتم کریں حَشَر لگ اسی غم سے آنسو بھریں

(عاشورنامہ، ص ۴۶)

(۵) مَرَگ (مَرْگ):

نہ کوئی کرے نظر تمنا اوپر پیالہ مَرَگ کا چکو زود تر

(وفات نامۂ بی بی، ص ۱۲۳)

۲۔ تخفیفِ صوت

(۱) صِفُت (صِفَت):

توئی حکم تے ہے سو سب کا اماں تری صِفُت کارن بنایا جہاں

(عاشورنامہ، ص ۳۵)

(۲) پکڑ (پَکڑ):

مہرباں ہو کر لیا پکُڑ ہاتھ غصہ کر کے خیمہ میں گئے لے کے ساتھ

(عاشورنامہ، ص ۱۲۱)

(۳) خبُر (خَبَر):

خدیجہ کو کہیا بنی نے تبی کہ جبریل نے خبُر دی مجھ ابھی

(وفات نامۂ بی بی، ص ۱۰۶)

(۴) نظُر (نَظَر):

فکر بیچہ بیٹھی تھی سر ڈال کر آئی چار زن نظُر اس وقت پر

(وفات نامۂ بی بی، ص ۱۰۸)

## ۷۔ طویل مصوتوں کی مختصر مصوتوں میں تبدیلی

اس دور کی اردو میں کبھی کبھی طویل مصوتوں کو مختصر مصوتوں میں تبدیل کر دیتے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ اس کے برخلاف مختصر مصوتوں کی طویل مصوتوں میں تبدیلی کا رجحان بہت کم ہے۔

(۱) اُپر (اوپر):

جو بتیا مجھ اُپر زیں قصہ تمام　　یقیں ترگشت قولِ "مولوی جام"

(بکٹ کہانی، ص ۳۶)

(۲) انکھوں (آنکھوں):

بہت دل شکستہ ہوگریاں ہوئیں　　انکھوں سیتی نہریں وہ فوراً بہیں

(۳) اسمان (آسمان):

کہ اب آگ برسے گی اسمان سے　　جلو اس کی (تہ میں) نہ اس دھیان سے

(عاشور نامہ، ص ۱۷۳)

(۴) دُسرے (دوسرے):

کہ ایک مار دُسرے کے اوپر پڑے　　کریں حملہ جس پر زمیں پر گرے

(عاشور نامہ، ص ۱۰۶)

## ۸۔ مصوتی تبادل

بہت سی دوسری صوتی خصوصیات کی طرح مصمتی تبادل بھی اس دور کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ مصمتی تبادل میں ایک مصمتے کو دوسرے مصمتے سے بدل دیا جاتا ہے۔ یہ عمل بعض عربی فارسی الفاظ کے ساتھ بھی پایا جاتا ہے۔ قدیم تصانیف میں مصمتی تبادل

کی حسبِ ذیل شکلیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

۱۔ /ر/ کے ساتھ /ل/ کا تبادل

(۱) کاری (کالی):

گھٹا کاری چہاروں اور چھائی ۔ برہ کی فوج نے کینی چڑھائی

(بکٹ کہانی، ص ۳۷)

(۲) بادر (بادل):

سیہ بادر چہاروں اور چھائے ۔ لیا مجھ گھیر پیو اجھوں نہ آئے

(بکٹ کہانی، ص ۳۸)

(۳) ہوری (ہولی):

(۳) نہ نار ہجر سب دیہی برے ری ۔ نہ آئی کنتھ گھر ہوری جرے ری

(بکٹ کہانی، ص ۵۷)

۲۔ /و/ کے ساتھ /ب/ کا تبادل

(۱) جاور (جابر):

یزید بہت جاور ہے نہ دل ڈرا ۔ دیکھو فوج بھاری کے تئیں لے چڑھا

۳۔ /ب/ کے ساتھ /و/ کا تبادل

(۱) بچن (وچن):

سندیسہ پیو کا مجھ کو سناؤ ۔ پیا کا مکھ بچن مجھ کوں لے آؤ

(۲) بچار (وچار):

جواب ان کو میں کیسے دیوں بچار ۔ مرد کی صورت ہوئے پوچھے پکار

(وفات نامۂ بی بی، ص ۱۱۸)

## ۴۔ /گ/ کے ساتھ /غ/ کا تبادل

(۱) کاگد (کاغذ):

سجن آئے نہ کاگد لکھ بھٹایا

(بکٹ کہانی، ص ۴۵)

(۲) داگ (داغ):

رہے ہیں پھول پھولوں کے گلے لاگ       مرے سینے جدائی کا لگا داگ

(بکٹ کہانی، ص ۵۸)

کسی زبان کی لسانی خصوصیات، دراصل اس زبان میں ظہور پذیر ہونے والی لسانی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ سترھویں صدی کی اردو کی بیشتر خصوصیات کا رشتہ پراکرت اور اپ بھرنش، بالخصوص شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش سے قائم کیا جاسکتا ہے۔ پراکرتوں کے ارتقا کے دوران لسانی تبدیلیوں کے زیر اثر پراکرتوں کی اپنی لسانی خصوصیات معرض وجود میں آئیں۔ پراکرتوں کے بعد جب اپ بھرنشوں کا ارتقا عمل میں آیا تو کچھ اور خصوصیات بھی ظہور میں آئیں۔ ... ۱ء میں اپ بھرنشوں کے خاتمے پر یہ خصوصیات جدید ہند آریائی بولیوں میں منتقل ہوگئیں۔ دہلی اور نواحِ دہلی کی تمام بولیوں نے شورسینی اپ بھرنش کی بیشتر خصوصیات اختیار کیں۔ اس عہد کے دوران ان بولیوں کی کچھ اپنی خصوصیات نے بھی ارتقا پایا۔ شمالی ہند میں اردو کے ارتقا کے دوران، دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں کی بہت سی خصوصیات اس دور کی اردو کا جزو بن گئیں۔ رفتہ رفتہ اردو کی قدیم لسانی خصوصیات زائل ہوتی گئیں، یہاں تک کہ جدید اور معیاری اردو کا نکھرا ہوا روپ سامنے آگیا۔

# حواشی

۱۔ بکٹ کہانی (محمد افضل افضل)، مرتبہ نورالحسن ہاشمی اور مسعود حسین خاں، بار دوم (لکھنؤ: ادارۂ فروغِ اردو، ۱۹۷۰ء)۔

۲۔ عاشور نامہ (روشن علی)، مرتبہ مسعود حسین خاں اور سفارش حسین رضوی، طبعِ اوّل (علی گڑھ، شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء)۔

۳۔ دیکھیے مرزا خلیل بیگ، "قدیم اُردو مراثی" مشمولہ ہندوستانی زبان، جلد ۱۲، نمبر ۱-۲ (جنوری-اپریل ۱۹۸۰ء)، ص ۲۹-۴۱۔ یہ مرثیے اس کتاب میں بھی شامل ہیں (دیکھیے ص ۱۲۶ تا ۱۴۰)۔

۴۔ نائب حسین نقوی نے اسمٰعیل امروہوی کی دو مثنویاں، وفات نامۂ بی بی فاطمہ اور معجزۂ انار، اردو کی دو قدیم مثنویاں کے نام سے شائع کردی ہیں۔ دیکھیے اردو کی دو قدیم مثنویاں، مرتبہ نائب حسین نقوی (لکھنؤ: دانش محل، ۱۹۷۰ء)۔

۵۔ خالق باری (ضیاء الدین خسرو)، مرتبہ حافظ محمود شیرانی، طبعِ اوّل (دہلی: انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، ۱۹۴۴ء)

۶۔ کربل کتھا (فضل علی فضلی)، مرتبہ مالک رام اور مختار الدین احمد (پٹنہ: ادارۂ تحقیقاتِ اردو، ۱۹۶۵ء)۔

۷۔ کربل کتھا ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب روضۃ الشہدا کا اردو ترجمہ ہے۔

۸۔ لھ، مھ، نھ بھی اردو کی ہکار آوازیں ہیں لیکن ان کا استعمال اردو کے صرف چند الفاظ تک محدود ہے اور ان میں بھی یہ صرف درمیانی حالت میں واقع ہوتی ہیں۔

(۱۹۸۳ء)

# قدیم اردو مراثی

یہ مراثی راقم الحروف کو پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب (۱۸۹۳ - ۱۹۷۵ء) کی عنایت سے حاصل ہوئے۔ ان کا ماخذ ۱۱۵۱ ہجری مطابق ۱۷۳۸ عیسوی کی لکھی ہوئی ایک بیاض ہے، لیکن زبان کی قدامت سے پتا چلتا ہے کہ یہ مرثیے اس سے بہت پہلے تصنیف کیے جا چکے تھے۔ ۱۷۳۸ء سے ٹھیک پچاس سال قبل یعنی ۱۶۸۸ء میں روشن علی نے اپنی شعری تصنیف عاشور نامہ سپرد قلم کی تھی۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ یہ مرثیے بھی غالباً اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنے مضمون "مراثی ریختہ: شمالی ہند کی قدیم ترین اردو نظمیں" (مشمولہ ماہی رسالہ تحریر ۱۶، دہلی) میں اس دور کے چند اور مرثیوں کا تعارف کرایا ہے۔ زیر نظر مرثیوں کے خالق صلاح، قربان اور قاسم ہیں جو غالباً دہلی کے باشندے تھے۔ افضل کی بکٹ کہانی اور روشن علی کے عاشور نامہ کے بعد یہ مرثیے شمالی ہند میں اردو نظم نگاری کی تیسری اہم کڑی ہیں جن سے اردو زبان کے ارتقا کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

یہ مرثیے اب تک غیر مطبوعہ تھے۔ انھیں راقم الحروف نے اپنے مختصر تعارفی نوٹ کے ساتھ پہلی بار مجلۂ ہندوستانی زبان میں شائع کرایا۔ (دیکھیے ہندوستانی زبان (بمبئی)، جلد ۱۲، نمبر ۱-۲، جنوری-اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۲۹-۴۱)۔

۱

پیارا فاطمہ کا، رن چلا ہے آہ واویلا

پیارا کربلا موں مبتلا ہے آہ واویلا
اوٹھا در کربلا از نالہائے شعلۂ ماتم

شفق کی آگ موں گردوں جلا ہے آہ واویلا
تنِ نازک کہ جس کوں مہد تھا آغوش زہرا کا

بہ خاکِ بیکسی غلطاں ہوا ہے آہ واویلا
جنھوں کے خواب کوں روح الامیں گہوارہ جنباں تھا

زمیں موں تشنہ لب مارا پڑا ہے آہ واویلا
جنھوں کی تاب رونے کی نہ لاتا مصطفیٰ ہرگز

زتیغ کافراں خوں میں بھرا ہے آہ واویلا
پیاسا جس گھڑی سوں وہ امامِ دیں سدھارا ہے

زاشکِ مومناں دریا بہا ہے آہ واویلا
بلایا اہلِ بیت خود بہ زین العابدیں سونپا

اکیلا ذوالجناح اوپر چلا ہے آہ واویلا
جو دیکھا اسپ شہ خالی، پکارا یہ یتیموں نے

ہمارے شاہِ دیں کوں کیا کیا ہے آہ واویلا

رواں از نرگسِ زہرا، ہوا ہے لال خوں جاری
حُسینِ سرّور در خوں بھرا ہے آہ واویلا

اکیلا شاہِ دیں بہرِ شہادت جب چلا رن موں
عزیزوں کے جگر خوں میں بھرا ہے آہ وا ویلا

ہوئے سب اہلِ بیت از سوز دامن گیر سلطاں کے
تجھے بن زندگی ہم کوں بَلا ہے آہ واویلا

پکارا شاہِ عالم نیں رضینا بن قضاءاللہ
تمھاری جان کا حافظ خدا ہے آہ وا ویلا

پیاسا بیکس و مجروح تن مظلوم درمیداں
گرا نورِ دو چشمِ مصطفا ہے آہ واویلا

جہاں وہ شاہِ دیں مارا پڑا ہے بیکس و تنہا
یتیموں کا گذر اس جا ہوا ہے آہ واویلا

جو دیکھا خاک موں غلطاں حسینِ شاہ کے سر کوں
جگر کے سوز سوں نالہ اٹھا ہے آہ واویلا

صلاح اس غم سوں انکھیاں سوں کرو سیلابِ خوں جاری
ستم سوں شاہِ دیں پیاسا گیا ہے آہ واویلا

(صلاح)

۲

باز محرّم رسید شور پڑا جا بجا
از سرِ نو شد پدید ماتمِ آلِ عبا

حیف کہ شاہ زمن خورد سم از مکرِ زن
کردے اندر لگن ریخت جگر پارہا
نورِ دو چشمِ رسول راحتِ جانِ بتول
جس کوں کیا ہے ملول آں حسنِ مجتبا
خاصۂ ربِّ جلیل بود حُسینِ جمیل
جس کوں کہا جبرئیل شاہ بنام حیا
وارثِ بیت الحرام صاحبِ رُکن و مقام
دید از اعدا مدام محنت و جور و جفا
کرد نہ یک لحظہ خواب خوردہ نہ یک جرعہ آب
وہ پسرِ بوتراب سبطِ رسولِ خدا
شمرِ لعین پدید کرد جفائے شدید
تیغِ ستم سوں برید حلق شہِ کربلا
کوفیِ پُر مکر و کیں کرد جفائے چنیں
غم سوں ہوا ہے حزیں جان و دلِ مصطفا
کیوں نہ گرا آسماں بر سرِ ایں خاکداں
تشنہ گیا از جہاں جب خلفِ مرتضا
خونِ دل آیا بہ جوش چرخ ہوا نیلہ پوش
کرد ازیں غم خروش حضرتِ خیرالنسا
عیسیٰ و روح الامیں بر فلکِ چارمیں
از غمِ آں مہ جبیں چاک کیے ہیں قبا

آہ ازیں دردو غم پشتِ فلک گشت خم
جب سوں شہِ محترم رفت زدارا لفنا
خلقِ جہاں زار ہیں غم سوں گرفتار ہیں
بادلِ افگار ہیں نس دن ازیں ماجرا
قمری و بلبل بہ باغ ہیں زالم بے دماغ
لالہ ہوا داغ داغ زیں غم وسوز و عزا
مدحِ شہِ ذوالجناح گشتہ شعارم صلاح
ہست امیدِ نجاح مجھ کو بروزِ جزا
(صلاح)

۳

ہے ہے ہوا شہید پسر بوتراب کا
غم سوں ہوا کباب جگر شیخ وشاب کا
ماتم خدا کے گھروں پڑا ہے ازیں عزا
ابتر شدہ است حال جہانِ خراب کا
بر روئے ماہ داغ کلف ہے ازیں الم
اس غم سوں رنگ زرد ہوا آفتاب کا
از سوز و دردِ تشنگی شاہِ کربلا
دریا کے منہ میں آبلہ نکلا حباب کا
در کربلا بہ قطرۂ آبے مدد نہ کرد
زاں روئے غرق خوں ہے زخجلت سحاب کا

جب سوں گیا ہے گرسنہ و تشنہ آں امام
تب سوں نہیں رہا ہے مزہ نان و آب کا

درد علی و اکبر و قاسم ہوئے شہید
تھا عہد نوجوانی و موسم شباب کا

ہوتا نہیں ہے مجھ کوں فراموش حالِ زار
اہلِ حرم کی تشنگی و اضطراب کا

پیچم بسانِ موے ز بس غم کی آگ سوں
حالِ من است رشتہ پر پیچ و تاب کا

کوفی و شامیوں نے کیا ظلم بے شمار
ان کو نہ تھا ملاحظہ روزِ حساب کا

جن نے کیا ہے آلِ نبی پر جفا و جور
وہ مستحق ہوا ہے خدا کے عذاب کا

اے مومناں بہ درد و الم روز و شب رہو
اندیشہ دل سوں محو کرو خورد و خواب کا

مجھ کوں صلاح وقتِ عبورِ پُلِ صراط
ہے آرزو حُسینِ علی کے رکاب کا (صلاح)

۴

اے مومناں حُسین و حَسن پر کہو درود
شاہِ زمین و ماہ گگن پر کہو درود

غافل نہ ہو یہ یک پل اس غم سوں روز و شب
ہر دم بدم نبی کے نین پر کہو درود

مقتولِ زہر قہر حسن پر کرو فغاں
مجروحِ تیغ کشتۂ رن پر کہو درود

مرجانشینِ شاہِ نجف پر کہو درود
ریحانشینِ فخرِ زمن پر کہو درود

از پا فتادہ نخلِ گلستانِ مصطفےٰ
باغِ علی کے سرو سمن پر کہو درود

رفت از جہاں ز زہر کیے واں دگر ز تیغ
زخمی جگر و تشنہ دہن پر کہو درود

بر شبّر و شبیر کرو جان و دل فدا
خونیں کفن و ماہ بدن پر کہو درود

بس دن رہو ز سوز چو سیماب بے قرار
خیر النسا کے ہر دو رتن پر کہو درود

ہر صبح و شام ورد کرو نامِ آں شہاں
بر سرورِ حجاز و یمن پر کہو درود

چو ابرِ نو بہار خروشان و اشک بار
دُر ہائے آبدارِ عدن پر کہو درود

دنیا سوں جز الم و جفا کچھ نہیں لیے
وو مبتلائے درد و محن پر کہو درود

در کربلا بہ رنج و عنا گشت مبتلا
دور از دیار و یار و وطن پر کہو درود

زہرا و مصطفٰے و علی و حسن حسین
آلِ عبا کے پانچ تنن پر کہو درود
فکرِ صلاح نیست بجز مدح و منقبت
اے سامعاں تم اس کے سخن پر کہو درود (صلاح)

۵

مارے گئے حسین و حسن حیف حیف حیف
غوغا اٹھا ز خلق زمن حیف حیف حیف
مروانِ لعنتی نے دیا ہے حسن کوں زہر
از دستِ زن بہ حیلہ و فن حیف حیف حیف
سلطانِ دیں حسین بہ پیغامِ کوفیاں
آیا بہ کربلا ز وطن حیف حیف حیف
در دستِ ظالمانِ ستم گار و بے وفا
پایا ہے جفا و محن حیف حیف حیف
مارا ہے ظالم بے رحم اور بے وفا
بر حلقِ خشک تشنہ لبن حیف حیف حیف
پانی طلب کیا ہے مکرر امام نے
کافر نہیں سنا ہے سخن حیف حیف حیف
وہ نورِ چشمِ ساقیِ کوثر ازیں جہاں
پیاسا گیا ہے تشنہ دہن حیف حیف حیف
کردند کوفیانِ لعیں بعدِ قتلِ شاہ
سجاد کے گلے موں رسن حیف حیف حیف

بر نیزہ ہا کیے ہیں سرِ سروراں دیں
درخاک وخوں فتادہ بدن حیف حیف حیف
آں سر کہ بود تکیہ گہش دوش مصطفٰے
شد بر سنان وتوے لگن حیف حیف حیف
رن موں رہا ہے جسم مطہر امام کا
کوئی نہیں دیا ہے کفن حیف حیف حیف
غلمان وحور جملہ کیے رختِ خود سیاہ
زیں سوگ در بہشتِ عدن حیف حیف حیف
تا شد فسردہ آں گلِ گلزارِ مصطفٰے
مرجھا گئے ہیں سرو وسمن حیف حیف حیف
آتش زدند خرمنِ گل را بہ صحنِ باغ
ایں غم سوں بلبلانِ چمن حیف حیف حیف
در کوہسار خندہ بھلایا ہے کبک نے
شیون اٹھا ز زاغ وزغن حیف حیف حیف
ہر سال ازیں مصیبتِ جاں سوز بر جگر
ہوتا ہے تازہ داغِ کہن حیف حیف حیف
جاں باختن حضورِ شہنشاہ اے صلاح
اس دن کہ تھا بہ طالعِ من حیف حیف حیف (صلاح)

۶

سوگ در عالم پڑا ہے یا امیرالمومنین
دل ازیں ماتم جرا ہے یا امیرالمومنین

شبر و شبیر کے ماتم سوں فریاد و فغاں

از ثریا تا ثریٰ ہے یا امیر المومنین

فوجِ اعدا سوں یہ ہفتاد و دو تن تیر اخلف

العطش کہتا رہا ہے یا امیر المومنین

اس گلے اوپر کہ بوسیدہ پیمبر بارہا

شمر نے خنجر دھرا ہے یا امیر المومنین

آں حُسینے راکہ پروردی تو در آغوشِ خویش

کشتہ در صحرا پڑا ہے یا امیر المومنین

آں شہنشا ہے کہ گلگوں کردرختش مصطفٰے

جامہ اش از خوں بھرا ہے یا امیر المومنین

ابر سوں جیوں مینہ برسا بر تنِ پاکِ حسین

قطرہ ہائے خوں جھڑا ہے یا امیر المومنین

با وجودِ ضعف و بیماری امام عابدیں

اس دکھوں روتا کھڑا ہے یا امیر المومنین

روزِ محشر سرنگوں برخیزد از خاکِ لحد

جو نہیں تجھ سے ڈرا ہے یا امیر المومنین

جن کیا یہ ظلم و بدعت برسرِ اولادِ تو

لعنہا بے چوں چرا ہے یا امیر المومنین

بادلِ غمگین و چشمِ خوں فشاں ہنس دن صلاح

دل الم زیں ماجرا ہے یا امیر المومنین

(صلاح)

۷

مارا ہے کافروں نے امامِ انام کوں
سلطانِ دیں حسین علیہ السلام کوں

دس روز کاروبارِ جہاں جملہ ابتر است
آزردہ کردہ اند مدارالمہام کوں

از کعبۂ شریف بُلائے بہ کربلا
ناحق کیے شہید ہمارے امام کوں

ہر سال کعبہ می شود از غم سیاہ پوش
مارا ہے جب سوں وارثِ بیت الحرام کوں

از اشکِ چشمِ اہلِ حرم زمزم است شور
پیاسا رکھا زبس شہِ رکن و مقام کوں

زیں غصہ تختِ خویش سلیماں بہ باد داد
یہ قصہ سن کے ڈال دیا جم نے جام کوں

زیر و زبر چرا نہ شد ایں کہنہ خاکداں
جب شہ چلا ہے روضۂ دارالسلام کوں

فارغ نہیں از یں الم و درد جن و انس
جارا ہے اس اگن نیں دلِ خاص و عام کوں

زہرا و مرتضٰی کے خلف کوں کیے شہید
داد ند غم رسولِ ذوی الاحترام کوں

غمگیں شدند جملۂ ذراتِ کائنات
ماتم ہوا وحوش و طیور و ہوام کوں

نیلا ہوا فلک زغمِ سبطِ مصطفےٰ
روتے ہیں اس الم سوں ملک صبح و شام کوں

افلاک پر بروج وکواکب بہ صد زباں
ان پر کہیں مدام درود و سلام کوں

آں عمرو سعد و ابنِ زیاد و یزید و شمر
برخود لیے ہیں طعنہ و لعنت مدام کوں

از خشمِ حق و قہرِ محمد نہیں ڈرے
راضی ہوئے عذاب و عتابِ دوام کوں

دوزخ میں جائے آپ پیے کاسۂ حمیم
شہ پر کیا ہے منع جن آب و طعام کوں

دیں کوں دیے بہ باد برائے جہانِ دوں
لعنت انھوں کے فکر و خیالاتِ خام کوں

ذکرِ غمِ حسین بود فکرِ ما صلاح
دیگر نہ می رسد سخنے اس کلام کوں (صلاح)

۸

رفتہ سبطِ احمدِ مختار آہ — یادگارِ حیدرِ کرّار آہ

تھا پیاسا بر لبِ آبِ فرات — نورِ چشمِ سیدِ ابرار آہ

با دلِ پُرخوں گیا ہے از جہاں — حجّتِ حق قدرتِ جبّار آہ

باشہِ دیں از رہِ بغض و نفاق — شامی و کوفی کیے پیکار آہ

از جفائے ظالماں لو ہوستیں — شد خضاب آں زلفِ عنبر بار آہ

کربلا موں قرۃ العینِ رسول — کشتہ شد از کافرِ خونخوار آہ

خولیِ ملعوں بھرایا بر سناں — از جفا کاری سرِ سردار آہ
اے دریغا برامامِ دیں کیے — کافراں ظلم و ستم بسیار آہ
بے رفیق و آشنا ہے عابدیں — ناتوان و خستہ و بیمار آہ
جن رکھا آزارِ شاہِ دیں روا — مصطفےٰ کوں ان دیا آزار آہ
ظلم برآلِ نبی ہر کس کہ کرد — ہے ازاں ملعوں، خدا بیزار آہ
ہست زیں اندوہ روحِ فاطمہ — روز و شب با دیدۂ خونبار آہ

در رکابِ شہ نہ تھا قربان علی
ورنہ کرتا جانِ خود ایثار آہ

(قربان علی)

[۹]

کشتہ شد فرزندِ حیدر ہائے ہائے — رفتہ دلبندِ پیمبر ہائے ہائے
بادہانِ خشک و چشمِ تر گئے — از جہاں شبیر و شبّر ہائے ہائے
کربلا موں کشتہ شد سبطِ رسول — از جفا ہائے ستمگر ہائے ہائے
باشہِ دیں کوفیِ بے دیں لڑے — ازبرائے دولت و زر ہائے ہائے
بوسہ گاہِ مصطفےٰ رابے دریغ — شمر ببریدہ ز خنجر ہائے ہائے
شد خضاب از خاک و خوں در کربلا — قرۃ العینینِ سرور ہائے ہائے
کافروں کے ظلم سوں رفت از جہاں — ہادی و مولا و رہبر ہائے ہائے
جب سوں آں سلطانِ دیں پیاسا گیا — تب سوں ہے شور آبِ کوثر ہائے ہائے
کعبہ و مشعر سیہ کردہ لباس — بے شہِ محراب و منبر ہائے ہائے
آفتابِ دیں چھپیا اس سوز سوں — ماہ و خور گشتہ مکدّر ہائے ہائے
جبرئیل و عیسیٰ و مریم کیے — زیں مصیبت خاک برسر ہائے ہائے

گشتہ امروزی اسیرِ ظالماں شافعانِ روزِ محشر ہائے ہائے

می شدے قربانِ شہ قربان علی

گر بودے اس وقت حاضر ہائے ہائے

(قربان علی)

۱۰

اے موناں ماتم کرو آیا محرم درجہاں

اے دوستاں باغم رہو آیا محرم درجہاں

خونِ جگر از دیدہا جاری کرو سیلابہا

بہرِ امامِ رہ نما آیا محرم درجہاں

غوغا ہوا ہے درجہاں یا ریدہ باراں آسماں

طوفانِ غم گشتہ عیاں آیا محرم درجہاں

گشتہ نبی زیں غم حزیں ہیں مصطفٰی اندوہ گیں

رو رو کہیں زہرا حیں آیا محرم درجہاں

روح الامین و قدسیاں ماتم کریں در آسماں

حوران و غلماں ہیں تپاں آیا محرم درجہاں

دنیا ہوا زیرو زبر ہر روز ہوتا ہے تبر

بیتاب ہے جان و جگر آیا محرم درجہاں

فرزندِ شاہِ موناں تنہا لڑا یا کافراں

لعنت کرو بر کوفیاں آیا محرم درجہاں

سرہائے جملہ سروراں لے کر چلے آں ظالماں

غوغا کیے سب انس و جاں آیا محرم درجہاں

اے دوستاں، اے مومناں، ماتم کرو بہرِ شہاں
حق نے کہا باعـــزوشاں آیا محرم درجہاں
عیسیٰ مریم زیں عزا نیلا کیا در برقبا
در چـــرخِ چارم جا رہا آیا محرم درجہاں
مارا ہے کافرنابکار معصوم طفلِ شیرخوار
زیں غم ہوا دل خار خار آیا محرم درجہاں
تابوت شہ کا لے چلے حور و ملک سب تلملے
از چشم ہا آنسو ڈھلے آیا محرم درجہاں
آں قاسم گل پیرہن بہرِ حسین پہنا کفن
بیکل ہوا سب انجمن آیا محرم درجہاں
زین العبادِ دردمند افتادہ اندر قید و بند
کافـــر کیا ہے مکر و چھند آیا محرم درجہاں
قاسم ہمیشہ درغم است با دوستاں در ماتم است
دائم رہوں گریاں کنم آیا محـــرم درجہاں
(قاسم)

# قدیم اردو اور ہریانی

اُردو اپنی ابتدا اور ارتقا کے دوران دہلی اور نواحِ دہلی کی تین بولیوں سے خاص طور پر متاثر ہوئی ہے جن کے نام ہیں: ہریانی، کھڑی بولی اور برج بھاشا۔ ان کے علاوہ راجستھانی کی ایک بولی میواتی نے بھی ابتدائی عہد میں اردو کو متاثر کیا ہے۔ لسانی اعتبار سے دہلی کا محل وقوع کچھ اس طور پر ہے کہ یہ چاروں بولیاں یہاں آکر مل جاتی ہیں، گویا دہلی ان بولیوں کا سنگم ہے۔ کھڑی بولی دہلی کے شمال مشرق میں جمنا پار کے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔ شمال مغرب کی جانب یہ شہر ہریانی سے گھرا ہوا ہے۔ جنوب مشرق میں ذرا آگے چل کر برج بھاشا ملتی ہے، اور جنوب مغرب میں میواتی کا چلن پایا جاتا ہے۔[1]

ان چاروں بولیوں میں سے اُردو کو اس کے ابتدائی عہد میں سب سے زیادہ ہریانی نے متاثر کیا ہے۔ اردو پر ہریانی کے اثرات کی طرف اشارہ سب سے پہلے ژول بلاک (۱۸۸۰ - ۱۹۵۳ء) نے اپنے ایک مضمون "ہند آریائی لسانیات

کے بعض مسائل" مطبوعہ بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، جلد ۵ میں کیا تھا۔[۲] بعد کو سید محی الدین قادری زور (۱۹۰۵ - ۱۹۶۲ء) نے اپنی تصنیف ہندستانی لسانیات (حیدرآباد، ۱۹۳۲ء) میں اردو پر ہریانی کے اثرات کا ذکر کیا:

"یہاں ایک اور بات مدِّنظر رکھنی چاہیے کہ اردو پر بانگڑو یا ہریانی زبان کا بھی قابلِ لحاظ اثر ہے۔"[۳]

اس کے بعد پروفیسر مسعود حسین خاں نے قدیم اردو اور ہریانی کے مواد کو سامنے رکھ کر ان ممکنات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا، اور اردو کی ابتدا سے متعلق ایک نئے لسانی نظریے کی تشکیل کی جس کی رُو سے:

"قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست ہریانی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑے ہیں۔"[۴]

اس نظریے کی مکمل تفصیل پروفیسر مسعود حسین خاں کی تحقیقی تصنیف مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو (دہلی، ۱۹۴۸ء) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں اپنے اس نظریے کا اعادہ وقتاً فوقتاً اپنے مختلف مضامین میں بھی کرتے رہے ہیں۔ امریکا کے مشہور جریدے CURRENT TRENDS IN LINGUISTICS میں مسعود صاحب کا ایک عالمانہ مضمون شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے اپنے اُسی لسانی نظریے کو دہرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"قدیم اُردو کی اساس دہلی کی ہریانی بولی پر قائم ہے۔ جب کہ جدید اردو نواحِ دہلی کی ایک دوسری بولی، کھڑی بولی کی بنیادوں پر معیاری بنائی گئی ہے۔"[۵]

(ترجمہ راقم الحروف)

دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں میں اپنی اہمیت کے پیشِ نظر، اردو کی ابتدا کے سلسلے میں ہریانی کے رول کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ محمود شیرانی (۱۸۸۰-۱۹۴۶ء)

نے، جنھیں ہریانی کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں تھا، قدیم (دکنی) اردو کو پنجابی سے ماخوذ بتایا ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف پنجاب میں اردو (لاہور، ۱۹۲۸ء) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قدیم (دکنی) اردو اور پنجابی میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس بنیاد پر انھوں نے جو لسانی نظریہ قائم کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اور پنجاب سے ہجرت کر کے مسلمانوں کے ساتھ دہلی پہنچی[۶]۔ محمود شیرانی کے اس نظریے کو ٹی۔ گراہم بیلی (وفات ۱۹۴۲ء) نے بھی اپنی تصنیف A HISTORY OF URDU LITERATURE (۱۹۳۲ء) میں قبول کیا ہے[۷]۔ لیکن پروفیسر مسعود حسین خاں کے خیال میں دکنی کا "پنجابی پن" اس کا "ہریانی پن" بھی ہے، کیوں کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ہریانی اور پنجابی میں خطِ فاصل قائم کرنا دشوار تھا[۸] اور ان دونوں زبانوں میں بہت سے عناصر مشترک تھے۔

اُردو کی جائے پیدائش دہلی اور نواحِ دہلی تسلیم کر لینے کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ ہم قدیم اردو کا رشتہ پنجابی سے استوار کریں۔ زبانیں اور بولیاں ہمیشہ اپنے قرب و جوار کی زبانوں اور بولیوں ہی سے متاثر ہوتی ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اردو کا ہریانی (جو دہلی اور دہلی کے شمال مغربی علاقے کی بولی تھی) سے متاثر ہونا، ایک لازمی امر تھا۔ قدیم (دکنی) اردو کی توجیہ جب ہریانی سے بہ خوبی کی جا سکتی ہے تو کوئی ضروری نہیں کہ اس کا مقابلہ ایک دور افتادہ علاقے کی زبان پنجابی سے کیا جائے۔

---

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنی تصنیف سب رس پر ایک نظر میں دکنی اردو پر ہریانی کے اثرات کو تسلیم کیا ہے۔ ان کے خیال میں "سب رس کی دکنی، ہندوستانی یعنی دہلی کی ہریانی سے بہت کچھ مشابہ ہے"[۹]۔ انھوں نے سب رس کی دکنی اور ہریانی کے موازنے

کے لیے دریائے لطافت سے چند ایسی لسانی خصوصیات نقل کی ہیں جو انشاؔ نے مختلف دہلوی باشندوں کی بول چال میں دیکھی تھیں اور جن کو انھوں نے ٹکسال باہر قرار دے دیا تھا۔ بہ قول ڈاکٹر سہیل بخاری یہ خصوصیات سب رس میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر بخاری نے مثنوی نل دمن اور قدیم ہریانی شعرار کے کلام کی تیس ایسی لسانی خصوصیات گنوائی ہیں[۱۰] جو ان کے خیال میں سب رس کی دکنی میں بھی ملتی ہیں۔

اس لسانی موازنے سے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو اور دکنی میں جتنا زیادہ اختلاف ہے، ہریانی اور دکنی میں اتنی ہی مشابہت موجود ہے[۱۱]"۔

قدیم اردو اور ہریانی کے تقابلی مطالعے سے ان دونوں زبانوں کی بہت سی مشترک خصوصیات سامنے آجاتی ہیں۔ اس تقابلی مطالعے کی بنیاد قدیم اردو کے حسب ذیل مواد پر رکھی گئی۔ معراج العاشقین (شاہ مخدوم حسینی[۱۲])، پرت نامہ (فیروز بیدری)، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (نظامی بیدری)، سب رس (ملا وجہی)، قطب مشتری (ملا وجہی)، خالق باری (ضیار الدین خسرو) بکٹ کہانی (محمد افضل) عاشور نامہ (روشن علی)، وفات نامۂ بی بی اور معجزۂ انار (اسمٰعیل امروہوی) اور کربل کتھا (فضلی)۔

قدیم ہریانی کے نمونوں کے لیے ہریانی کی قدیم تصانیف سے استفادہ کیا گیا ہے جن میں سے چند یہ ہیں: در دنامہ (شیخ محبوب عالم)، فقہ ہندی (شیخ عیدی)، تیرہ ماسہ (اکرم رہتکی) خواب نامہ (شاہ عبدالحکیم) اور رباعیات شاہ غلام جیلانی رہتکی ان کا ماٰخذ محمود شیرانی کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے "اردو کی شاخ ہریانی" کے نام سے اورینٹل کالج میگزین (لاہور) میں ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء کے دوران لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ شیرانی کی تصنیف پنجاب میں اردو میں بھی ان مصنفین کے کلام کے نمونے مل جاتے ہیں۔

یہ مزید ہریانی بولی کے نمونوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور اس کے لیے پروفیسر جگ دیو سنگھ کے مقالے "ہریانی: ایک توضیحی تعارف"[۱۴] سے مدد لی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ہریانی بولی پر ان کی تحقیقی تصنیف بانگڑو کی توضیحی قواعد[۱۵] کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔

۲

## ھریانی کی چند اہم لسانی خصوصیات جو قدیم اردو میں بھی پائی جاتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

## صوتی خصوصیات

۱۔ /ڑھ/ کی آواز ہریانی میں نہیں پائی جاتی یہ /ڈھ/ کی آواز سے بدل دی جاتی ہے /ڑ/ کی آواز اگرچہ ہریانی میں پائی جاتی ہے لیکن بعض اوقات /ڑ/ کی آواز کو بھی /ڈ/ سے بدل دیا جاتا ہے۔ زرد نامہ سے یہ مثالیں ملاحظہ ہوں: "پڈھے" (پڑھے)، "بڈائی" (بڑائی)، "پڈھنا" (پڑھنا)، "چڈھنا" (چڑھنا)، وغیرہ۔ قدیم اردو میں /ڑ/ کو /ڈ/، اور /ڑھ/ کو /ڈھ/ سے بدلنے کی مثالیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں مثلاً سب رس میں "چڈھنا" (چڑھنا)، قطب مشتری میں "بڈا" (بڑا)، عاشور نامہ میں "ایڈ" (ایڑ)، کربل کتھا میں "بڈاؤں" (بڑھاؤں)، وغیرہ۔

۲۔ مصوتوں کی طوالت بھی ہریانی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ فقہ ہندی اور درد نامہ سے مثالیں ہیں: "راکھ" (رکھ)، "لاگا" (لگا)، وغیرہ۔ قدیم اردو میں یہ خصوصیت عام ہے، مثلاً عاشور نامہ میں "باگل" (بغل)، "جاگہ" (جگہ)، "ماٹی"، (مٹی)، اور کربل کتھا میں "کیدھر" (کدھر)، "لاگا" (لگا)، "سیوا" (سوا) وغیرہ۔

(۳) قدیم ہریانی میں مصوتوں کی انفیت بھی ایک عام خصوصیت ہے۔ تیرہ ماسہ، دردنامہ اور محشرنامہ سے چند مثالیں پیش ہیں : "کونچ" (کوچ)، "توں" (تو)، "پہلیں" (پہلے)، وغیرہ۔ قدیم اردو تصانیف میں یہ خصوصیت جا بجا پائی جاتی ہے، مثلاً قطب مشتری میں "برسانت" (برسات)، "سنتانا" (ستانا)، "کونچ" (کوچ)، "سائراں" (سائرہ)، نیز بکٹ کہانی میں "سیں" (سے) وغیرہ۔

۴۔ ہریانی اور قدیم اردو کی ایک عام خصوصیت مصمتوں کی غیر ہکاریت ہے۔ ہریانی تصانیف میں "بی" (بھی)، "مُج" (مجھ)، "ابی" (ابھی)، "کچ" (کچھ) جیسے الفاظ عام ہیں۔ قدیم اردو میں بھی ہکاریت سے عاری الفاظ جا بجا ملتے ہیں، مثلاً قطب مشتری میں "سکی" (سکھی)، "کچ" (کچھ)، "لکنا" (لکھنا)، "مج" (مجھ)، اور عاشورنامہ میں "دُود" (دُودھ)، "ہات" (ہاتھ)، "ساتی" (ساتھی) وغیرہ۔

## صرفی ونحوی خصوصیات

۱۔ ہریانی اور قدیم (دکنی) اردو میں 'نے' کا استعمال علامتِ فاعل کے طور پر بھی ہوتا ہے اور علامتِ مفعول کے طور پر بھی۔ البتہ دکنی میں حالتِ مفعولی میں 'نے' کے علاوہ 'کو' کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ جدید اردو میں 'نے' صرف علامتِ فاعل اور 'کو' صرف علامتِ مفعول کے طور پر رائج ہے۔

جدید ہریانی سے یہ مثالیں[۵۱] دیکھیے:

(الف) 'نے' علامتِ فاعل کے طور پر:

اُس نے گاں کے لٹھ ماریا (اُس نے گائے کو ڈنڈا مارا)۔

بالک نے دودھ پیا تھا (بچّے نے دودھ پیا تھا)۔

(ب) 'نے' علامتِ مفعول کے طور پر۔

رام کُتّے نے پیٹے سے (رام کُتّے کو مارتا ہے)۔

مَن نے کتاب پڑھنی سے (مجھے کتاب پڑھنی ہے)۔

رام نے ایک گھوڑا چاہیے (رام کو ایک گھوڑا چاہیے):

قدیم دکنی سے مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

(الف) 'نے' علامتِ فاعل کے طور پر:

تم نے دوُدھ پیے سو خوب کیے (معراج العاشقین)

بادشاہاں نے دنیا کا حظ چھوڑے (سب رس)

(ب) 'نے' علامتِ مفعول کے طور پر:

آدمی بُرا اچھے تو شراب نے کیا کرنا (سب رس)

۲۔ ہریانی اور قدیم اردو دونوں ہی میں ماضیِ مطلق بنانے کے لیے مصوتوں پر ختم ہونے والے فعلی مادّوں کے بعد 'یا' داخل کیا جاتا ہے، مثلاً ماریا (مارا)، چلیا (چلا)، دیکھیا (دیکھا)، بولیا (بولا)، کہیا (کہا)، لگیا (لگا)، سکیا (سکا)، وغیرہ۔

(۱) دل تن کے ملک کی بادشاہی کرنے لگیا (سب رس)۔

(۲) دل کھولیا، بات سنا تھا سو بولیا (سب رس)۔

(۳) اپنے نور کے آئینے میں دیکھیا (معراج العاشقین)۔

۳۔ ہریانی میں جمع بنانے کے لیے اسم کے آخر میں 'اں' لگاتے ہیں۔ قدیم اردو میں بھی 'اں' کے ساتھ جمع بنانے کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں، مثلاً

(۱) تج عاشقاں میں ہوتا جنگ وجدل سوں سب دن (قلی قطب شاہ)

(۲) و لے عارفاں پاس انصاف ہے (وجہی)
(۳) پلکاں کے نشتر کے انگے نشتر کوں نشتر نا کہو (ہاشمی)
(۴) کہ بلبلاں کوں جہنم ہوا چمن تجھ بن (ولی)

۴۔ قدیم اردو کے ضمائر بھی تقریباً وہی ہیں جو ہریانی کے ہیں، مثلاً میں، ہم، توں، تم (ہریانی تم)، یو (ہریانی ریوہ)، یہ، اُس، اُن، او (ہریانی یوہ) وہ، کون (ہریانی کوُنڑ)، کس، کن، جو، جس، جن، میرا، تیرا، وغیرہ۔

۵۔ ہریانی اور دکنی کے حروف بھی کافی حد تک یکساں ہیں، مثلاً سوں، کوں، سیں، موں، ماںہہ، ناںہہ، آگوہ، پچھوں، پر، تے، سیتی وغیرہ۔

۶۔ قدیم اردو کی فعلیہ شکل آئے کر، جائے کر، کھائے کر، لائے کر وغیرہ بھی ہریانی کی ایک خصوصیت ہے۔ اس کی مثالیں شیخ محبوب عالم کے محشر نامہ میں ملتی ہیں[16]۔ جدید اردو میں اس کی صورت آکر، جاکر، کھاکر ہو جاتی ہے۔

۳

پروفیسر گیان چند جین کو پروفیسر مسعود حسین خاں کے اس نظریے سے کہ "قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست ہریانی کے زیرِ اثر ہوئی ہے اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں[17]"، شدید اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک "اردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے[18]"، وہ قدیم ہریانی مصنفین مثلاً شیخ عبداللہ انصاری، شیخ محبوب عالم، اکرم رہتکی وغیرہ کو قدیم اردو مصنفین میں شمار کرتے ہیں۔ ان کی تصانیف کے بارے میں پروفیسر جین کا خیال ہے کہ یہ اردو میں ہیں، بانگرو یعنی ہریانی میں نہیں، نیز ہریانی کے علاقے میں لکھے جانے کی وجہ سے ان میں کہیں کہیں ہریانی کا اثر آگیا ہے[19]۔ قدیم ہریانی پر قدیم اردو کا دھوکا انھیں اس وجہ سے ہوا کہ ابتدا میں قدیم ہریانی اور قدیم اردو میں بہت زیادہ مماثلیں موجود تھیں۔ چوں کہ دہلی اور نواحِ دہلی کا علاقہ

(شمال مغربی) ہریانی کے زیر اثر تھا (دہلی انتظامیہ کا دیہات کا علاقہ آج بھی ہریانی کے زیر اثر ہے)، اس لیے قدیم اردو کا ہریانی کے اثرات قبول کرنا ناگزیر تھا۔

پروفیسر گیان چند جین قدیم و جدید ہریانی میں فرق نہیں کرتے۔ وہ قدیم و جدید ہریانی کو ایک مانتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ہریانی کیا ہے یہ جاننے کے لیے ہریانہ علاقے کے بے پڑھے لکھوں کا روزمرہ دیکھیے۔ اردو سے اس کا اختلاف دیکھ کر شاید یہ نہ کہا جا سکے کہ قدیم اردو براہِ راست ہریانی سے تشکیل پاتی ہے۔"[۲۰]

وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زبانوں میں بھی تبدیلی ایک لازمی امر ہے۔ آج نہ تو کہیں قدیم اردو بولی جاتی ہے اور نہ قدیم ہریانی۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ایک ہی خاندانِ السنہ کی دو زبانوں یا ایک ہی زبان کی دو بولیوں میں بھی فرق بڑھتا جاتا ہے۔ جو فرق آج موجودہ اردو اور قدیم اردو میں پایا جاتا ہے وہی فرق موجودہ ہریانی اور قدیم ہریانی میں بھی ہو سکتا ہے۔ موجودہ ہریانی کی عینک سے ہم قدیم ہریانی کو نہیں دیکھ سکتے۔ قدیم ہریانی کو قدیم ہریانی ہی کی طرح دیکھنا چاہیے۔ جدید اردو اور جدید ہریانی میں جو فرق آج ہم دیکھ رہے ہیں وہ فرق قدیم اردو اور قدیم ہریانی میں موجود نہیں تھا۔ ارتقائی حالت میں ہونے کی وجہ سے دونوں میں کافی حد تک مماثلتیں پائی جاتی تھیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ پروفیسر گیان چند جین کو قدیم ہریانی تصانیف پر قدیم اردو تصانیف کا دھوکا ہوا ہے۔ ابتدا میں تو پنجابی اور ہریانی میں بھی نمایاں فرق موجود نہیں تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم پنجابی تصانیف کو ہریانی تصانیف اور ہریانی تصانیف کو پنجابی تصانیف سمجھ لیں۔ دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں کے باریک اختلافات کی نشاندہی اور ان کے لسانیاتی تجزیے کے بعد ہم ہریانی کو اردو کا نقطۂ آغاز ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

# حواشی

۱۔ دیکھیے مسعود حسین خاں، "دکنی یا اردوے قدیم"، شعر و زبان (حیدر آباد، ۱۹۶۶ء)، ص ۱۷۳۔

۲۔ بہ حوالہ مسعود حسین خاں، مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو، طبع چہارم (علی گڑھ: سر سید بکڈپو، ۱۹۷۰ء)، ص ۲۴۲، [اشاعتِ اوّل ۱۹۴۸ء]

۳۔ سید محی الدین قادری زور، ہندستانی لسانیات (لکھنؤ: نسیم بکڈپو، ۱۹۶۰ء)، ص ۹۵، [اشاعتِ اوّل ۱۹۳۲ء]

۴۔ مسعود حسین خاں، تصنیف مذکورہ، ص ۲۴۱۔

۵۔ مسعود حسین خاں، "اردو" مشمولہ CURRENT TRENDS IN LINGUISTICS جلد ۵ (موتال، ۱۹۷۰ء)، ص ۲۷۹ – ۲۸۰۔

۶۔ دیکھیے حافظ محمود خاں شیرانی، پنجاب میں اردو (لکھنؤ: نسیم بکڈپو، ۱۹۷۰ء)، ص ۱۹، [اشاعتِ اوّل ۱۹۲۸ء

۷۔ بہ حوالہ مسعود حسین خاں، "اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ"، فکر و نظر (علی گڑھ)، جلد ۹، شمارہ ۲ (۱۹۶۹ء)، ص ۱۴۔

۸۔ دیکھیے مسعود حسین خاں، "پیش لفظ" مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو۔

۹۔ سہیل بخاری، سب رس پر ایک نظر (نئی دہلی: آر۔ کے۔ پرکاشن، قرول باغ، س ن)، ص ۹۸۔

۱۰۔ دیکھیے ایضاً ص ۱۰۱ - ۱۰۶

۱۱۔ ایضاً ص ۱۰۷۔

۱۲۔ معراج العاشقین پہلے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف سمجھی جاتی تھی، لیکن حالیہ تحقیق

سے یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین اس تحقیق کے متعلق لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر حسینی شاہد نے امین الدین علی اعلیٰ پر اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں دریافت کیا کہ معراج العاشقین بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف نہیں، بلکہ بہت بعد کے شاہ مخدوم حسینی کے رسالہ تلاوت الوجود کی تلخیص ہے۔ حسینی شاہد کا مقالہ نومبر ۱۹۶۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل کیا گیا۔ ان کے نگراں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اسی نکتے پر مفصل تحقیق کر کے 'معراج العاشقین کا مصنف' نامی کتاب ۱۹۶۸ء میں شائع کی۔ ڈاکٹر حسینی شاہد کا مقالہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ یہ تحقیق حسینی شاہد کی ہے، لیکن اس کی اشاعت کا سہرا ڈاکٹر حفیظ قتیل کے سر ہے۔"

دیکھیے گیان چند جین، "اردو میں تحقیق و تدوین کے معیار کا جائزہ (۱۹۶۰ء تا ۱۹۸۰ء)"، مشمولہ علی گڑھ میگزین (ہم عصر اردو ادب نمبر)، مرتبہ عبید صدیقی، ۸۲-۱۹۷۹ء، ص ۳۱۱۔

۱۳۔ جگ دیو سنگھ، "ہریانی — ایک وِوَرَناتمک پریچے" [ہریانی: ایک توضیحی تعارف]، مشمولہ جرنل آف ہریانا اسٹڈیز، جلد ۴، حصۂ اول و دوم (۱۹۷۳ء)، ص ۷۲-۱۰۳۔

۱۴۔ جگ دیو سنگھ، A DESCRIPTIVE GRAMMAR OF BANGRU [بانگرو کی توضیحی قواعد]، (کروکشیتر: کروکشیتر یونیورسٹی، ۱۹۷۰ء)۔

۱۵۔ جدید ہریانی کی یہ مثالیں پروفیسر جگ دیو سنگھ کے محولہ بالا مضمون "ہریانی - ایک توضیحی تعارف" (ہندی) سے لی گئی ہیں۔

۱۶ - بہ حوالۂ مسعود حسین خاں، مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو ، طبعِ چہارم (علی گڑھ: سرسید بکڈپو، ۱۹۷۰ء) ، ص ۲۴۸ -

۱۷ - ایضاً ، ص ۲۴۱ -

۱۸ - گیان چند جین ، "اردو کے آغاز کے نظریے" ، مشمولہ ہندوستانی زبان (بمبی) ، جلد ۹ ، شمارہ ۳-۴ (جولائی - اکتوبر ۱۹۷۷ء) ، ص ۷ -

۱۹ - ایضاً ص ۹ -

۲۰ ایضاً -

(۱۹۷۹ء ، نظرِ ثانی ۱۹۸۴ء)

# قدیم اردو کا سرمایۂ الفاظ

اُردو زبان کا بنیادی ڈھانچا ہند آریائی ہے۔ اسی لیے اس کے ذخیرۂ الفاظ کا معتدبہ حصّہ ہند آریائی مآخذ پر مشتمل ہے۔ اردو کے ایک قابلِ لحاظ ذخیرۂ الفاظ کا تعلق 'تدبھو'، یعنی درمیانی ہند آریائی مآخذ سے ہے جن میں 'پراکرتیں' اور 'اپ بھرنشیں' خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ سنسکرت کے بے شمار 'تتسم' الفاظ بھی اردو میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔ اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں بہت سے دیسی الفاظ بھی شامل ہیں۔ اردو نے جدید ہند آریائی زبانوں مثلاً پنجابی، مراٹھی، گجراتی، سندھی وغیرہ سے بھی الفاظ مستعار لیے ہیں۔ مغربی ہندی اور مشرقی ہندی کی بولیوں کے بے شمار الفاظ بھی اردو میں وقتاً فوقتاً شامل ہوتے رہے ہیں۔ دکنی اردو میں دراوڑی زبانوں بالخصوص کنڑا اور تلگو کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ جدید اردو میں انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کے الفاظ بھی کافی تعداد میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان مآخذ کے علاوہ اردو میں عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ عربی فارسی سے آئے ہوئے الفاظ اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا اہم جزو

بن گئے ہیں۔ اردو نے اپنے ارتقا کے دوران میں نہ صرف عربی فارسی بلکہ ترکی زبان سے بھی الفاظ مستعار لیے ہیں جو ایک زمانے میں ہندوستان کے حکمراں طبقے کی اپنی زبان تھی۔

قدیم اردو کے سرمایۂ الفاظ کو تتسم، تدبھو، دیسی، عربی فارسی، ترکی اور دراوڑی الفاظ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۲

**تتسم** کے معنی ہیں 'اُس جیسا'۔ 'اُس' سے یہاں مراد سنسکرت زبان ہے۔ سنسکرت الفاظ جب بغیر کسی تبدیلی یا ردّو بدل کے استعمال ہوتے ہیں تو 'تتسم' کہلاتے ہیں۔ قدیم اردو میں بے شمار سنسکرت الفاظ بالکل اسی طرح استعمال ہوئے ہیں جیسے کہ وہ سنسکرت میں استعمال ہوتے تھے، مثلاً سُندر، گیان، جَل، بالک، سنسار وغیرہ۔

تتسم الفاظ قدیم ہند آریائی دور (۱۵۰۰ ق م تا ۵۰۰ ق م) سے تعلق رکھتے ہیں۔ قدیم ہند آریائی دور میں زبان کی دو مختلف شکلوں کا ارتقا عمل میں آیا جنھیں 'ویدک سنسکرت' اور 'کلاسیکی سنسکرت' کہتے ہیں۔ سنسکرت زبان کا ارتقا ۱۵۰۰ ق م میں آریوں کے داخلۂ ہند سے شروع ہوتا ہے۔ ۵۰۰ ق م تک پہنچتے پہنچتے سنسکرت کا ارتقا رک گیا اور اس کی جگہ پراکرتوں نے لے لی۔ وسطی ہند آریائی دور (۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ء) میں شمالی ہند کے مختلف خطّوں میں مختلف قسم کی پراکرت بولیاں رائج تھیں۔

قدیم اردو میں تتسم الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کا استعمال اردو میں شروع ہی سے آزادانہ طور پر ہوتا رہا ہے۔ دکنی تصانیف میں تتسم الفاظ کا تناسب اور بھی زیادہ ہے۔ ایک خاص مرحلے تک پہنچنے کے بعد رفتہ رفتہ تتسم الفاظ کی تعداد اردو میں کم ہوتی گئی اور ان کی جگہ عربی و فارسی الفاظ نے لے لی۔ شاہ ظہور الدین حاتم

(۱۶۹۹ - ۱۷۸۱ء) اور مرزا مظہر جان جاناں (۱۷۰۰ - ۱۷۸۱ء) کی تحریکِ اصلاحِ زبان سے متاثر ہو کر شاعروں نے اٹھارہویں صدی کے وسط میں تتسم اور تدبھو الفاظ کی ایک بڑی تعداد کو اردو زبان سے خارج کر دیا۔ ڈاکٹر شری رام شرما نے قدیم دکنی اردو میں تتسم الفاظ کے بکثرت استعمال کی دو وجہیں بیان کی ہیں[۱]۔ اوّلاً اردو کے آغاز و ارتقا کے دوران میں جن صوفیائے کرام نے تبلیغ و اشاعت دین کا کام کیا وہ ویدانت اور ہندو فلسفے سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اسلامی خیالات و افکار اور ہندوستانی فلسفے میں امتزاج پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اپنی اس کوشش میں انھوں نے چند تبدیلیوں کے ساتھ انھیں اصطلاحات کو استعمال کیا جنھیں ہندوستانی فلسفی پہلے استعمال کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان صوفیوں کے ملفوظات میں خالص سنسکرت الفاظ کا استعمال بہ کثرت ملتا ہے۔ سنسکرت الفاظ کے بہ کثرت استعمال کی دوسری وجہ دکنی شاعروں اور ادیبوں کی سنسکرت کے کلاسیکی ادب سے واقفیت ہے جس کی وجہ سے انھیں سنسکرت کے ذخیرۂ الفاظ تک بڑی آسانی سے رسائی حاصل تھی۔

---

ڈاکٹر شری رام شرما نے اپنی تصنیف دکھنی ہندی کا اُدبھو اور وِکاس (پریاگ، ۱۹۶۴ء) میں ایسے تتسم الفاظ کی ایک طویل فہرست دی ہے جو دکنی شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف میں آزادانہ طور پر پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند الفاظ یہاں درج کیے جاتے ہیں:

(۱) خواجہ بندہ نواز گیسو دراز: جیون، جیو، رَس، رِزگُن۔

(معراج العاشقین)

(۲) برہان الدین جانم: بالک، سنسار، سیوک، بھید، دَیا، جَل، کرودھ، پرکار، جیون، گیان، اُپکار، پوجا، چِتر، اُتّم۔

(ارشاد نامہ)

(۳) علی عادل شاہ ثانی : اَدھر، گج، گگن، کھنڈ، رُوپ، چندن، دَھن، گھٹ، نَین، سُندر۔ (کلیاتِ علی عادل شاہ)

(۴) ابنِ نشاطی. بھار، نیر، مُکھ، رَزمل، جگت، سُندر۔

(پھول بن)

(۵) قاضی محمود بحری : گیان، انت، بَل، سماچار، روگی۔

(من لگن)

شمالی ہند کی قدیم اردو تصانیف میں بھی تتسم الفاظ بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ بکٹ کہانی، دیوانِ فائز، اور قصۂ مہرافروز و دلبر میں تتسم الفاظ جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ عاشور نامہ، مراثیِ ریختہ اور کربل کتھا جن میں واقعاتِ کربلا کا بیان ملتا ہے، تتسم الفاظ کی تعداد نسبتًا کم ہے۔ شمالی ہند کے قدیم مصنّفین کے یہاں تتسم الفاظ کی مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

(۱) محمّد افضل افضلؔ : لوک، ناگ، مَن، کر، کٹھن، دیہہ، سُکھ، مُکھ، جیو، کتھا، رُوپ۔

(بکٹ کہانی)

(۲) روشن علی : نَین، اَدِھک، مُکھ، بھید، گیان، نیر، جگت۔

(عاشور نامہ)

(۳) اسمٰعیل امروہوی : سنسار، مُکھ، جیو، تاپ، بھار، انت، داس، آنند۔

(معجزۂ انار)

(۴) فائز دہلوی : مُکھ، جَل، جیو، کپول، مَن، پریت، سُندر، بھَوَن، سیوا، اَدھر، اَدِھک، پاپ۔

(دیوان فائز)

(۵) فضل علی فضلی : بالک ، بھید ، جیو۔

(کربل کتھا)

(۶) عیسوی خاں بہادر : سُکھن ، اُپما ، کرانتی ، انگ ، سمے ، سُگندھ ، سمُوہ ، اَدِھک ، سَمُدُر ، پَوَن ، مَند ، ساگر ، ہِت ، ہَتیا ، سَبھا ۔

(قصۂ مہر افروز و دلبر)

۳

سنسکرت الفاظ جب اپنی بدلی ہوئی حالت میں استعمال ہوتے ہیں تو 'تدبھو' کہلاتے ہیں۔ تدبھو الفاظ کی بنیاد اگرچہ سنسکرت ہے ، لیکن وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کی شکل وصورت اور روپ میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی ، لیکن اتنی بھی نہیں کہ انھیں پہچانا نہ جاسکے ۔ اردو میں ایسے الفاظ کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کا ماخذ سنسکرت یا قدیم ہند آریائی ہے اور جو درمیانی ہند آریائی دور میں تبدیلی کے عمل سے گذرے ہیں۔ اردو میں تدبھو الفاظ کی مثالیں یہ ہیں ، جیسے کام (س : کرم) ، دودھ (س : دُگدھ) ، ناچ (س : نرتیہ) گھوڑا (س : گھوٹک) وغیرہ ۔

اردو کے لفظی سرمایے کا انحصار زیادہ تر وسطی ہند آریائی (پراکرت اور اپ بھرنش) پر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ تتسم الفاظ کے مقابلے میں اُردو میں تدبھو الفاظ کی تعداد زیادہ ہے ۔ اردو نے پراکرت اور اپ بھرنش سے کثیر تعداد میں الفاظ لیے ہیں ۔ اردو کے بنیادی ڈھانچے کی طرح اردو کا لفظی سرمایہ بھی شاہ حاتم کے دور تک ایک بڑی حد تک ہند آریائی تھا ۔ لیکن تحریکِ اصلاحِ زبان کے زیرِ اثر اس دور کے شعرا نے اردو کے ایک کثیر سرمایۂ الفاظ کو متروک قرار دے دیا اور اس کی جگہ عربی فارسی الفاظ استعمال کرنے لگے ۔ جن صوتیاتی خطوط پر سنسکرت الفاظ

ـنے تدبھو الفاظ کی شکل و صورت اختیار کی وہ یہ ہیں :

## ۱۔ مصوتے

۱۔ مختصر مصوتوں کی طویل مصوتوں میں تبدیلی :

(الف) اَ < آ :

| سنسکرت | | اردو |
| --- | --- | --- |
| کَرْم | < | کام |
| سَپْت | < | سات |
| ہَسْت | < | ہاتھ |
| اَشْرُ | < | آنسو |

(ب) اِ < ای :

| | | |
| --- | --- | --- |
| بھِکْش | < | بھیک |
| شِکْش | < | سیکھ |
| جِہْو | < | جیب (جیبھ) |

(ج) اُ < اُو :

| | | |
| --- | --- | --- |
| دُگْدھ | < | دُودھ |
| پُتْر | < | پُوت |
| اُشْٹْر | < | اُونٹ |

## ۲۔ مصمتے

۱۔ ہکار آوازوں کی /ہ/ میں تبدیلی :

(الف) کھ > ہ:

مُکھ > مُنہہ

(ب) تھ > ہ:

کتھ > کہہ

(ج) گھ > ہ:

میگھ > مینہہ

(د) دھ > ہ:

دَدھی > دہی

۲۔ غیر مسموع مصمتوں کی مسموع مصمتوں میں تبدیلی:

(الف) چ > ج:

کُنچکا > گُنجی

پَنچک > پنجا

(ب) ٹ > ڈ:

گھوٹک > گھوڈا (جدید اردو: گھوڑا)

کپٹک > کپڈا (جدید اردو: کپڑا)

۳۔ کوزی /نْ/ کی تالوی /ن/ میں تبدیلی:

پُرنْ > پان

کرنْ > کان

دُوگنْ > دُگنا

۴۔ /ش/ اور /شْ/ کی /س/ میں تبدیلی:

شواس > سانس

شَت > سو

شراونٹ > ساون

وَرشٹ > برس

(۵) ایک مصمتے کا دوسرے مصمتے کے ساتھ تبادل:

(الف) و > ب:

وَش > بس

وانَر > بندر

سُرُو > سب

وائُ > باو (ہوا)

(ب) ی > ج:

یَوَ > جَوَ

کاریَ > کاج

یَتُن > جَتن

## ۳۔ مرکّب مصمتے

(۱) گ + دھ > دھ:

دُگدھ > دوُدھ

(۲) پ + ت > ت

سَپتُ > سات

(۳) ر + و > ب

سَرُو > سب

(۴) ت + ر < ت

پُتْر < پوُت

(۵) ر + پ < پ

سَرْپ < سانپ

(۶) ر + ب < ب:

دُرْبَل < دُبلا

(۷) س + ت < ت (تھ)

ہَسْت < ہات (ہاتھ)

۴

اردو کے قدیم مصنفین کے یہاں تدبھو الفاظ بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ اردو کی قدیم تصانیف سے صرف وہی تدبھو الفاظ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں۔

(۱) ملّا وجہی: بَکَٹ، بِرَت، پرگٹ، پُن، درس، دِشت، دھیر، سُرگ، کَھم، گُن، گھپو، برّاسا، بِنس، نیہہ، بِدی، اگن، بِس، پردھان، پُرش۔ (قطب مشتری)

(۲) قاضی محمود بحری: آد، ادھار، آسا، استری، آکاس، پران، پرکاس، پرتھمی، تھان، دوس، رُت، سریر، سؤر، کن، گرب، مارگ، گیانی، بھانت، اچھر۔ (من لگن)

(۳) میراں یعقوب: پیو، جنم، درپن، دِیس (دِوَس)، لوک، انگ، سپنا، پچنت، باس۔ (شمائل الاتقیا)

(۴) عبدل دہلوی: بُدّھ، بچن، شرن، بچار، اُلاس، دھن (دھنیہ)،

سپورن (سمپورن) ، اَرَتھ ، جَس ، پربت ، بھوئی۔

(ابراہیم نامہ)

(۵) محمد افضل افضل : پرپت ، رَت ، جتن ، بچن ، مؤرکھ ، میت ، جَنَم ، سندیسا

(بکٹ کہانی)

(۶) روشن علی : پرگٹ ، کارن ، بچن ، ہیا ، رَن ، اَچرَج ۔

(عاشور نامہ)

(۷) اسمٰعیل امروہوی : میت ، جتن ، بوڈھا ۔

(معجزۂ انار)

(۸) فائز دہلوی : درپن ، چھب ، گت ، پَچرن ، مَن ، دَرس ، مَدھ ، بن۔

(دیوان فائز)

(۹) فضل علی فضلی : ہونٹھ ، ماٹی ، پوت ، جیبھ ، اندھیار ، بھوئیں۔

(کربل کتھا)

(۱۰) عیسوی خاں بہادر : پربت ، سپنا ، گُن ، دیپ ، دھیرج ، بیوگ ، جوت ۔

(قصۂ مہر افروز و دلبر)

(۱۱) شاہ مبارک آبروؔ : بَن ، اَچرَج ، جوت ، جوگی ، برہ ، گھیو ، اگن ، بِتیا ۔

(دیوانِ آبرو)

۵

اردو زبان کے سرمایۂ الفاظ میں دیسی الفاظ کو وہی اہمیت حاصل ہے جو تتسم اور تدبھو الفاظ کو حاصل ہے ۔ دیسی کے معنی 'ملکی' یا 'مقامی' مراد لیے جاتے ہیں۔ جن الفاظ کے مآخذ کا سنسکرت یا پراکرت زبانوں میں سراغ نہیں ملتا انھیں دیسی الفاظ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جان بیمز کا خیال ہے کہ ایسے الفاظ ہندوستان کی قدیم زبانوں سے

دخیل الفاظ کے طور پر آئے ہیں[۵۴]۔ سنیتی کمار چیٹر جی (۱۸۹۰ - ۱۹۷۷ء) کے مطابق ایسے الفاظ ماقبل آریائی زبانوں مثلاً دراویدی، آسٹرک وغیرہ سے آئے ہیں۔ اسی لیے آریائی زبانوں میں ان کے مآخذ کا سراغ نہیں ملتا۔ یہ الفاظ دراصل ان زبانوں اور بولیوں کی باقیات ہیں جو آریوں کی آمد سے قبل اس خطۂ ارض میں بولی جاتی تھیں[۵۵]۔ تتسم اور تدبھو الفاظ کے شانہ بشانہ اردو میں دیسی الفاظ بھی کافی تعداد میں استعمال ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ان کا استعمال اسی طرح برقرار ہے۔ ایسے چند دیسی الفاظ جو اردو میں آج بھی مستعمل ہیں یہ ہیں۔ مثلاً پیٹ، کٹورا، کٹار، ڈھول، گھونٹ، جھاڑ، گھاٹ وغیرہ[۵۶]۔ ان الفاظ کی ایک صوتی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں معکوسی آوازوں کا بہت گہرا امتزاج پایا جاتا ہے۔

۶

اردو زبان کی اساس اگرچہ ہند آریائی ہے، لیکن اس کے ذخیرۂ الفاظ میں عربی اور فارسی زبانوں کے بے شمار الفاظ شامل ہیں۔ فارسی ہندوستان کی مقتدر زبان رہ چکی ہے۔ صدیوں تک اسے یہاں کی سرکاری و دفتری، تہذیبی و ثقافتی نیز علمی و ادبی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ مسلم حکمراں جو ہندوستان میں وقتاً فوقتاً وارد ہوتے رہے مختلف زبانیں بولتے تھے۔ ان تمام زبانوں میں فارسی کو خاص اہمیت اور مرتبہ حاصل تھا۔ اس زبان نے شمالی ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں۔ محمود غزنوی (وفات ۱۰۳۰ء) سے لے کر مغلوں تک بیشتر ہندوستانی حکمراں ترکی النسل تھے اور ترکی ان کی مادری زبان تھی۔ لیکن ایرانی تہذیب و تمدّن کا اثر ان پر اتنا گہرا تھا کہ ہر دور میں فارسی ہی سرکاری اور تہذیبی زبان قرار پاتی رہی۔

عربوں کی فتح ایران کے بعد عربی زبان کو ایران میں کافی فروغ حاصل ہوا۔ چنا

ردّوبدل اور ترمیم و اضافے کے بعد فارسی زبان کے لیے عربی رسم خط اختیار کیا گیا۔ اس طرح عربی کے بے شمار الفاظ فارسی میں داخل ہونے لگے۔ ترکوں اور ایرانیوں کی ہندوستان میں آمد کے سبب عربی بھی جو ان کی مذہبی زبان تھی یہاں آ گئی یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اردو میں عربی الفاظ براہِ راست عربی زبان سے داخل نہیں ہوئے بلکہ فارسی کے توسّط سے اردو میں داخل ہوئے۔ اردو نے ان الفاظ کو اپنی زبان کے مزاج و منہاج اور صوتی آہنگ کے مطابق اختیار کیا۔

اگرچہ اردو نے مختلف غیر ہند آریائی زبانوں بالخصوص عربی اور فارسی سے بے شمار الفاظ مستعار لیے ہیں، لیکن اردو زبان کے لسانی ڈھانچے میں جو اہمیت ہندی الاصل الفاظ کو حاصل ہے وہ کسی اور زبان کے الفاظ کو حاصل نہیں۔ یہ امر بدیہی ہے کہ ہندی الاصل الفاظ کے استعمال کے بغیر اردو کا کوئی جملہ تشکیل نہیں پا سکتا جب کہ اردو میں ایسے بے شمار جملے بن سکتے ہیں جن میں ایک بھی عربی فارسی لفظ استعمال نہ ہوا ہو۔ نثر میں انشاء اللہ خاں انشاؔ (۱۷۵۲ - ۱۸۱۷ء) کی رانی کیتکی کی کہانی (۱۸۰۳ء) اور نظم میں آرزوؔ لکھنوی کی سُریلی بانسری ایسی ہی مثالیں ہیں جن میں بجز ہندی الفاظ، عربی فارسی کا ایک بھی لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔

تتسم اور تدبھو الفاظ کی طرح عربی فارسی الفاظ بھی اردو میں اس زبان کے دورِ آغاز ہی سے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ ابتدائی دور میں اردو کا ارتقا ریختہ کی شکل میں ہوا۔ اس میں نہ صرف عربی فارسی الفاظ کی آمیزش ہوتی تھی بلکہ فارسی کے فقرے اور جملے بھی استعمال ہوتے تھے۔ امیر خسروؔ (۱۲۵۳ - ۱۳۲۵ء) کی غزلیں اور محمد افضل افضلؔ (وفات ۱۶۲۵ء) کی بکٹ کہانی اس کی بہترین مثالیں ہیں جن میں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کے بھی فقرے، ٹکڑے، مصرعے اور محاورے استعمال

ہوئے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا فارسی کی نحوی ساختیں اردو میں کم ہوتی گئیں اور اردو پر فارسی کے اثرات صرف الفاظ کی حد تک ہی باقی رہ گئے۔ اردو نے عربی فارسی الفاظ اپنے صوتی مزاج کے مطابق اختیار کیے ہیں۔ قدیم اردو تصانیف میں املا کی بے قاعدگیاں اس کا بیّن ثبوت ہیں لیکن اٹھارہویں صدی کے وسط میں تحریک اصلاحِ زبان کے زیرِ اثر شاعروں نے عربی فارسی الفاظ کے اصل تلفّظ اور املا پر زور دینا شروع کیا۔ مرزا مظہر جانِ جاناں اور شاہ حاتم نے بے شمار تتسم اور تدبھو الفاظ متروک قرار دے کر ان کی جگہ پر عربی فارسی الفاظ کو ترجیح دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان بزرگوں نے اپنی کوششوں سے اردو زبان کو معیاری بنانے کی خدمات انجام دیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس قسم کی اصلاحات سے اردو زبان اپنی اصل ڈگر سے تھوڑی ہٹ گئی۔ اصلاحِ زبان کی تحریک دہلی کے بعد انیسویں صدی کے پہلے نصف حصّے میں لکھنؤ میں ابھری اور ناسخ اس کے بانی قرار پائے۔

قدیم اردو میں مستعمل عربی فارسی الفاظ کی ایک طویل فہرست ہے جس میں مذہبیات، ملکی نظم ونسق، انتظام و انصرام، فوج و اسلحہ، ملبوسات، فواکہات و میوہ جات، خورد و نوش، آرائش و زیبائش، امراض و تشخیص، علاج و معالجہ، اعضائے بدن، فنونِ لطیفہ، ادبیات و جمالیات اور آداب و القاب وغیرہ سے متعلق الفاظ شامل ہیں۔ یہ الفاظ اردو میں آج بھی اسی طرح رائج ہیں۔ ان کی ایک مختصر فہرست ذیل میں دی جاتی ہے:

(۱) الٰہی، رسول، نبی، قیامت، بہشت، مومن، فرشتہ، خلا، عارف، جہنّم، دوزخ، امام، امامت، نماز، مزار، ثواب، قرآن، محشر، حشر، عبادت، وضو، اذان، مسجد، سجدہ، شریعت، دین، بندگی، جنّت، مرشد، اجر، عذاب، معرفت، خودی، عرش، منکر، تجلّی، نور۔

(۲) تاج ، حکم ، شہزادہ ، خلافت ، انتظام ، رشتہ ، قاصد ، تخت ، دربان ، محل ، رئیس ، قاضی ، عادل ، عدالت ، انصاف ، بادشاہ ، وزیر ، سلطنت ، ملک ، فرمان ، وطن ، رعایا ۔

(۳) فوج ، جنگ ، خنجر ، قاتل ، دشمن ، پیادہ ، سوار ، تیر ، شمشیر ، تیغ ، لشکر ، حملہ ، کارزار ، زخم ، خیمہ ، مہم ، صلح ، سپاہ ، سپہ سالار ، نیزہ ، فتح ، مجروح ، قلعہ ۔

(۴) پردہ ، دستار ، سرپیچ ، جامہ ، عبا ، رومال ، لباس ، خرقہ ، کلاہ ، کفن ، چادر ، پیراہن ، جیب ۔

(۵) دانہ ، شراب ، آب ، چقندر ، انار ، نمک ، پیاز ، ثمر ، نان ، گوشت ، کباب ، شربت ، گندم ، قلیہ ۔

(۶) حکیم ، نسخہ ، دوا ، شفا ، تشخیص ، نبض ، دق ، عطار ، طبیب ، قبض ، پیچش ، ہیضہ ، درد ، زہر ، لقوہ ، فالج ، بیمار ، پرہیز ، علاج ۔

(۷) رخسار ، لب ، قد ، ابرو ، خال ، زبان ، چشم ، رخ ، مژگاں ، دہن ، اشک ، خون ، عارض ، گیسو ، نگاہ ، دل ، پا ، ناخن ، تن ، بدن ، سر ، دوش ، پشت ، چہرہ ، چہرہ ، دست ۔

(۸) فن ، شاعر ، تصویر ، عکس ، بت ، سنگ ، شبیہہ ، رنگ ، سخن ، لفظ ، تشبیہ ، معنی ، مفہوم ، نغمہ ، مطرب ، مرصع ، بیت ۔

(۹) حسن ، عشق ، عاشق ، وصل ، وفا ، نازک ، شوخ ، محبت ، شرم ، بہار ، گل ، فراق ، غم ، گریہ ، الم ، ادا ، چمن ، اختلاط ، جدائی ، جمال ، سرشار ، ہجر ، رشک ، تغافل ، جفا ، مہر ، سراپا ، سرخ ، حور ، مطرب ، شیریں ، دلبر ، رقیب ، نرگس ، نظارہ ، قامت ، نازک ۔

۷

اُردوؔ میں ترکی الفاظ کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہندوستان میں محمود غزنوی اور محمد غوری سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک جتنے بھی حکم راں ہوئے ان میں زیادہ تر ترکی النسل تھے، تاہم اردو پر ترکی زبان کے اثرات بہت گہرے نہیں پڑ سکے ہیں۔ اس کے بہت سے تاریخی، تمدّنی اور لسانی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ہمیں یہاں ان سے بحث نہیں۔ لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ فارسی اور عربی کے بعد جس غیر ہندآریائی زبان کے نقوش اردو پر سب سے زیادہ مرتسم ہوئے تو وہ ترکی ہی ہے۔

اردو میں ترکی الفاظ زیادہ تر فوج و اسلحہ، ملبوسات، خورد و نوش اور سماجی القاب سے متعلق ہیں مثلاً توپ، توپچی، چاقو، یلغار، یورش، سپاہ، نقّارہ، تمغہ، قاب، چمچہ، باورچی، قورمہ، قیمہ، قاش، خاتون، خان، خانم، بیگ، بیگم، بی بی، آغا، بابا، سوغات، کمک، سراغ، وغیرہ[۵۷]۔

۸

دراویڈی زبانیں کسی زمانے میں شمال مغربی ہندوستان کے ایک بڑے خطے میں بولی جاتی تھیں لیکن براہوئی سے قطع نظر اب ان زبانوں کے مراکز دکن اور جنوبی ہند کی ریاستیں ہیں۔ اگرچہ ابھی قطعی طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ دراویڈی زبانوں کے بولنے والے ابتدا میں کہاں آباد تھے اور وہ ہندوستان میں کب وارد ہوئے لیکن یہ بات مورخین نے بھی تسلیم کی ہے کہ "اُس وقت جب کہ آریا نسل کے قبیلے شمال مغربی ہندوستان میں آ کر آباد ہونے لگے، یہاں کی زبان ڈراوڑی اور آبادی کا بڑا اور ممتاز حصّہ ڈراوڑی تھا[۵۸]۔"

دراویڈی زبانیں ایک بالکل الگ تھلگ لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔

اپنی صوتی، صرفی، نحوی اور دیگر خصوصیات کی بنا پر یہ زبانیں ہند آریائی اور ہند یورپی خاندانِ السنہ کی زبانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اُردو اپنے معرضِ وجود میں آتے ہی دکن پہنچ گئی۔ وہاں اس کا واسطہ ایک طرف مرہٹی اور گجراتی زبانوں سے پڑا جو اس وقت تشکیلی دور سے گذر رہی تھیں اور دوسری طرف دراویدی زبانوں سے۔ گجراتی اور مرہٹی چوں کہ ہند آریائی زبانیں ہیں اس لیے اردو پر ان کے اثرات دُور رس ثابت ہوئے۔ دراویدی زبانوں نے اردو پر اپنے اثرات اس حد تک نہیں ڈالے جس حد تک پنجابی، مرہٹی، گجراتی اور دیگر ہند آریائی زبانوں کے اثرات اردو پر مرتسم ہوئے ہیں۔ تاہم قدیم دکنی تصانیف میں دراویدی زبانوں بالخصوص تلگو اور کنڑ کے الفاظ خال خال دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شری رام شرما نے دکنی تصانیف میں ایسے چند الفاظ کی نشاندہی کی ہے جن کا تعلق دراویدی زبانوں سے ہے[۹]۔

# حواشی

۱۔ شری رام شرما، دکنی زبان کا آغاز و ارتقا، مترجمہ غلام رسول (حیدر آباد: آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۶۷ء)، ص ۲۳۹ - ۲۴۰۔ اصل کتاب بزبانِ ہندی: دکھنی ہندی کا اُدبھو اور وکاس (پریاگ: ہندی ساہتیہ سمیلن، ۱۹۶۴ء)

۲۔ جان بیمز، اے کمپیریٹیو گرامر آف دی ماڈرن آرین لینگویجز آف انڈیا [ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کی تقابلی قواعد]، ہندوستانی ایڈیشن (دہلی: منشی رام منوہر لال، ۱۹۶۶ء)، ص ۱۱۲ [طبع اوّل، ۱۸۷۲ء]

۳۔ سُنیتی کمار چیٹرجی، دی اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف دی بنگالی لینگویج [بنگالی زبان کا آغاز و ارتقا]، (لندن: جارج ایلن اینڈ انون لمیٹڈ، ۱۹۷۰ء)، ص ۱۹۱ [طبع اوّل، ۱۹۲۶ء]

۴ ۔ ان الفاظ کے مآخذ کے لیے دیکھیے، پنڈت ہرگووند داس سیٹھ، پائیا سدّ مہنّوو (پراکرت ہندی لغت) مرتبۂ واسودیوشرن اگروال، دوسرا ایڈیشن (وارانسی: پراکرت ٹکسٹ سوسائٹی، ۱۹۶۳ء)۔

۵ ۔ رانی کیتکی کی کہانی کا سالِ تصنیف عام طور پر ۱۸۰۳ء خیال کیا جاتا ہے، لیکن مولانا امتیاز علی عرشی نے اس کا سالِ تصنیف ۱۸۰۸ء قرار دیا ہے۔ سید سلیمان حسین کا خیال ہے کہ "چونکہ اس کہانی کا ذکر انشا نے اپنی مشہور کتاب دریائے لطافت میں نہیں کیا، اس لیے یہ ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۰۸ء یا اس کے بعد کی تصنیف ہے۔" دیکھیے رانی کیتکی کی کہانی، مرتبۂ سید سلیمان حسین (لکھنؤ: کتاب نگر، ۱۹۷۵ء) ص ۹ ۔ ۱۰ ۔

۶ ۔ دیکھیے حامد اللہ ندوی، "اردو میں ترکی اثرات کی کمی کے اسباب"، مشمولہ ہندوستانی زبان (بمبئی) جلد ۴، نمبر ۱ (اکتوبر ۱۹۷۲ء)۔

۷ ۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے اکمل ایوبی، "اردو پر ترکی زبان کے اثرات"، سہ ماہی تحریر، (دہلی) جنوری-مارچ ۱۹۷۱ء ۔ اور "اردو میں ترکی الفاظ"، مشمولہ معارف (اعظم گڑھ)، دسمبر ۱۹۷۱ء

۸ ۔ محمد حبیب، تاریخ تمدنِ ہند (نئی دہلی: ترقیِ اردو بیورو، ۱۹۷۲ء)، ص ۲۵ ۔

۹ ۔ دیکھیے شری رام شرما، تصنیفِ مذکورہ (اردو ترجمہ)، ص ۲۵۵ ۔ ۲۵۹ ۔ (۱۹۷۹ء)

# اردو رسمِ خط اور املا
# تاریخی ارتقا کی روشنی میں

اُردو رسمِ خط، عربی رسمِ خط کی 'ترقی یافتہ' اور 'توسیع شدہ' شکل ہے۔
عربی رسمِ خط نبطی رسمِ خط سے ارتقا پذیر ہوا جس کا ماخذ آرامی رسمِ خط ہے[1]۔ عربی رسمِ خط چند ترمیمات و اصلاحات کے بعد پہلے فارسی زبان کے لیے اختیار کیا گیا، پھر کچھ اور تغیر و تبدّل اور ترمیم و اضافے کے بعد یہی رسمِ خط اردو کے لیے اختیار کر لیا گیا۔ گذشتہ ایک ہزار سال کے دوران ایران اور ہندوستان میں اس رسمِ خط میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کی تفصیل بیحد دلچسپ ہے۔

عربی رسمِ خط عرب فاتحوں کے ساتھ ساتویں صدی عیسوی کے ربعِ دوم (۶۳۳ء تا ۶۴۱ء کے دوران)[2] میں ایران پہنچا۔ ایرانیوں نے جب اس رسمِ خط کو اپنی زبان کے لیے اختیار کیا تو اس میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کیں۔ ابتداً عربی حروفِ تہجی میں بہ شمولِ ہمزہ ذیل کے صرف ۲۹ حروف شامل تھے:

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص
ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن و ہ ء ی ے

ایران کے خواجہ ابو العالی بک نے فارسی کی چار مصمتی آوازوں کو ظاہر کرنے والے چار نئے حروف کا اس میں اضافہ کیا جس سے اس کے حروفِ تہجی کی تعداد ۳۲ ہو گئی۔ یہ حروف ہیں:

پ ، چ ، ژ ، گ

ان حروف کو فارسی زبان میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ فارسی کے یہ حروف نقطوں اور مرکز کے اضافے سے وضع کیے گئے ہیں اور ان کی صورت عربی کے مقررہ حروف کی اصل صورت سے مختلف نہیں۔

عربی رسم خط کا اندازِ تحریر اور طرزِ کتابت 'نسخ' کہلاتا ہے، اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، عربی رسم خط (خطِ نسخ) نبطی رسم خط سے اخذ کیا گیا ہے۔ قدیم زمانے میں عرب میں ایک اور رسم خط رائج تھا۔ جسے کوفی خط کہتے ہیں۔ خطِ نسخ کی طرح یہ بھی نبطی خط سے ماخوذ ہے۔ محمد اسحاق صدیقی نے اپنی تصنیف فنِ تحریر کی تاریخ (علی گڑھ ۱۹۶۲ء) میں قدیم عرب مصنفین کے اس خیال کو غلط قرار دیا ہے کہ خطِ نسخ تیسری صدی ہجری کی ایجاد ہے اور اسے کوفی سے اخذ کیا گیا ہے۔ اُن کے خیال میں "خطِ نسخ تقریباً اتنا ہی پرانا ہے جتنا خطِ کوفی، اور وہ کوفی سے ماخوذ نہ تھا، بلکہ دونوں نبطی خط سے اخذ کیے گئے۔ کوفی خط کوفہ اور بصرہ میں، اور خطِ نسخ مکہ اور مدینہ میں ارتقا پذیر ہوا۔"[۴]

ایران کے ایک اور عالم خواجہ میر علی تبریزی نے بہ عہدِ امیر تیمور 'نسخ' اور 'تعلیق'[۵] کو ملا کر ایک نیا رسم خط ایجاد کیا جو 'نستعلیق' (نس (خ) + تعلیق) کہلایا۔[۶] آج اُردو کے لیے یہی رسم خط مروّج ہے۔ شمالی ہند کے قدیم اردو مخطوطات، مثلاً بکٹ کہانی

(محمد افضل افضل)، عاشور نامہ (روشن علی)، کربل کتھا (فضل علی فضلی)، قصۂ مہر افروز و دلبر (عیسوی خاں بہادر) وغیرہ اسی رسم خط میں تحریر شدہ دستیاب ہوئے ہیں۔ دکنی مخطوطات زیادہ تر خطِ نسخ میں ہیں۔[۸] چند دکنی مخطوطات خطِ ثلث میں بھی پائے گئے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ عربی رسم خط "پہلی بار اردو کے لیے پندرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں، دکن میں خطِ ثلث کی شکل میں استعمال کیا گیا۔ ہندوستان میں نستعلیق کا رواج سولہویں صدی کے شروع میں ہوا۔"[۸] غالباً اسی کے پیشِ نظر ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "اردو کو رسم خط دینے والے جنوبی ہندوستان والے ہیں۔"[۹]

۲

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ عربی فارسی رسم خط بھی یہاں آیا۔ مختلف اوقات میں یہاں آنے والے مسلمان اگرچہ تین مختلف زبانیں یعنی عربی، فارسی اور ترکی بولتے تھے، لیکن ان کا رسم خط ایک ہی تھا۔ بارہویں صدی عیسوی کے اختتام کے بعد دہلی اور نواحِ دہلی میں اردو اپنے آغاز و ارتقا کے مراحل سے ابھی گذر ہی رہی تھی کہ اس زبان میں امیر خسرو (۱۲۵۳ - ۱۳۲۵ء) جیسا شاعر پیدا ہوا۔ چوں کہ اردو اپنی ابتدائی حالت میں ریختہ کی صورت میں تھی اور اس کے تمام تر مصنفین کم و بیش فارسی کے بھی عالم و فاضل اور ادیب تھے، لہٰذا انھوں نے اس نوزائیدہ زبان کے لیے بلا تامل عربی فارسی رسم خط اختیار کر لیا۔ چوں کہ اس وقت تک عربی فارسی اور ترکی زبانوں کے ہزارہا الفاظ اردو (جسے پہلے ہندی کہتے تھے) میں داخل ہو چکے تھے اور بہ صورتِ ریختہ فارسی اور اردو (یعنی ہندی) کی 'پیوند کاری' شروع ہو چکی تھی اور اردو (ہندی) کلام میں فارسی تراکیب و مرکبات، مصطلحات و فقرات، نیز فارسی مصرعوں اور ٹکڑوں کی آمیزش اس دور کی زبان کا مزاج اور خاصہ بن چکی تھی، اس لیے عربی فارسی

رسم خط اس زبان کے لیے عین موزوں تصوّر کیا گیا۔ دیگر اہم بات یہ ہے کہ اردو کے ارتقائی دور میں شمالی ہند میں دوسرا ایسا کوئی بھی رسم خط موجود نہیں تھا جسے عربی فارسی رسم خط پر ترجیح دی جاتی۔ ہندوستان کا ایک قدیم رسم خط دیوناگری ضرور موجود تھا، لیکن اس کا زیادہ تر استعمال سنسکرت جیسی مردہ زبان کے لیے ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا حلقۂ اثر و استعمال بہت محدود تھا اور اردو کے ابتدائی عہد کے مصنفین بہ استثنائے چند، اس رسم خط سے بالکل ہی نابلد تھے پھر دیوناگری رسم خط میں اُردو (عربی فارسی) آوازوں مثلاً /ف/، /ز/، /ژ/، /خ/، /غ/ اور /ق/ وغیرہ کے اظہار کی صلاحیت بھی نہیں تھی۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں عربی فارسی رسم خط کو اس دور میں جو مقبولیت حاصل ہو گئی تھی وہ دیوناگری یا کسی اور رسم خط کو حاصل نہیں تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ یہاں فارسی کا غلبہ تھا۔ مکتبوں اور مدرسوں، درباروں اور دفتروں، نیز خط و کتابت اور تصنیف و تالیف میں، غرض کہ ہر جگہ فارسی ہی کا چلن تھا۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کوئی تخصیص نہیں تھی، بلکہ دونوں کی حالت یکساں تھی۔ یہاں مولوی عبدالحق (۱۸۶۹ – ۱۹۶۱ء) کا یہ قول نقل کرنا بیجا نہ ہوگا جس سے ہندوؤں میں فارسی کی زبردست مقبولیت کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے:

> "ہندوؤں نے تو اس کے حاصل کرنے میں بڑا کمال دکھایا۔ ان میں فارسی کے ایسے فاضل ادیب اور شاعر گذرے ہیں کہ ان کی بعض تصانیف اب تک مستند سمجھی جاتی ہیں اور مدتوں داخلِ نصاب رہیں، متواتر مطالعہ، مشقِ شعر و سخن، روزمرہ کی نوشت و خواند، صحبتِ اہلِ علم، نیز اس وقت کے ماحول اور رواج کی وجہ سے فارسی ان کے دل و دماغ میں رچ گئی تھی اور تقریباً ان کی اپنی زبان ہو گئی تھی۔" ؎۱۰

اسی ضمن میں راجہ شیو پرشاد 'ستارۂ ہند' کے اس خطبے کا اقتباس بھی نقل کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے ۱۸۶۸ء میں بنارس انسٹی ٹیوٹ کے جلسے میں "کچھ بیاں اپنی زباں کا" کے عنوان سے پڑھا تھا:

"ہندو لوگ نہ صرف آپس کے درمیان فارسی میں خط و کتابت جاری رکھتے تھے اور اپنے گھر کا حساب بھی فارسی میں لکھتے تھے بلکہ اگر لفظ صحیح ہوتا، میں کہہ سکتا کہ مُعَرّس بن گئے تھے۔ جس قدر وہ زیادہ مقرب بارگاہِ سلطانی تھے اسی قدر زیادہ مبتلا اس بلائے عظیم کے تھے۔ اُس وقت کے ہندو مصنفوں کا حال جو سر ہنری ایلیٹ صاحب نے اپنی کتاب میں درج فرمایا ہے، لائق دیکھنے کے ہے۔ صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ "ہندو مصنّف کی تصنیف میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے اس کی قوم اور اس کا مذہب ظاہر ہو سکے۔ ہاں شاید کسی قدر عبارت کا غیر فصیح اور پُر تکلف ہونا البتہ اس بات کی انگشت نمائی کرتا کہ غیر کی پوشاک اس کے بدن پر کیسی نازیبا ہے۔ وہ ہندوؤں کو کافر لکھتا ہے اور مسلمانوں کو مومن۔ وہ پیروں کی ایسی تعظیم کرتا ہے کہ گویا اُن کا بڑا معتقد ہے۔ جب کبھی ہندو مارے جاتے ہیں، وہ لکھتا ہے داخل فی النّار والسقر شدند، جب کسی مسلمان کا ایسا حال ہوتا ہے تو لکھتا ہے، شربتِ شہادت نوشیدند۔ وہ اپنے حاکموں کے معمولی الفاظ اور محاوروں کا اس قدر عادی ہو گیا ہے کہ وہ لکھتا ہے: نورِ اسلام، محرم الحرام۔ قرآن شریف اور بسم اللہ بغیر تو کچھ شروع ہی نہیں کرتا اور حمد و نعت بھی وہ اپنے دیباچے میں بہت ضروری سمجھتا ہے۔ ایک بڈھا ہندو مصنّف جو بخوبی جانتا ہوگا کہ جلد ہی چِتا میں پھُنک کر اور راکھ کی ڈھیر ہو کر گنگا میں بہایا جائے گا، اپنے تئیں 'برسرِ تابوت' اور 'بر کنارۂ گور' لکھتا ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بہت سی باتیں وہ مصنّف خوشامد

کی راہ سے جان بوجھ کر اپنے مسلمان مالکوں کے خوش کرنے کو لکھتے تھے، تاہم ہم کو اس بات کے دکھلانے کے لیے کہ پراکرتوں کی نہروں میں کس طرح فارسی لفظوں کی سیلابی آ گئی، بہت کارآمد ہیں۔" [۱۱]

اس دور میں فارسی رسمِ خط کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہندی (یہاں مراد بولیوں سے ہے، مثلاً اودھی وغیرہ) کی کتابیں بھی عام طور پر اسی رسمِ خط میں تیار کی جاتی تھیں، چنانچہ اودھی کے مشہور شاعر ملک محمد جائسی (۱۴۹۵ - ۱۶۳۹ء) کی پدماوت (۱۵۴۰ء) کے جتنے بھی قدیم نسخے دریافت ہوئے ہیں وہ سب فارسی رسمِ خط میں ہیں۔ نہ صرف پدماوت بلکہ ملک محمد جائسی کی دیگر تصانیف کا رسمِ خط بھی فارسی ہی ہے [۱۲] اور نہ صرف ملک محمد جائسی بلکہ دیگر مسلمان اور ہندو مصنفین نے بھی کم و بیش اپنی تصانیف فارسی رسمِ خط ہی میں لکھی ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب (۱۸۹۳ - ۱۹۷۵ء) نے اپنی کتاب اردو زبان اور اس کا رسمِ خط (۱۹۴۸ء) میں ہندی کی ایسی کتابوں کی ایک طویل فہرست دی ہے جو فارسی رسمِ خط میں لکھی ہوئی دستیاب ہوئی ہیں۔ [۱۳] ان کتابوں کے مصنفین، بہ استثنائے چند سب ہندو ہیں لیکن انھوں نے اپنی تصانیف کے لیے فارسی رسمِ خط اختیار کیا۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں جو مقبولیت فارسی رسمِ خط کو حاصل تھی اور جتنا زیادہ چلن اس دور کے شمالی ہندوستان میں اس رسمِ خط کا تھا کسی اور رسمِ خط کا نہیں تھا۔ فارسی زبان اور فارسی رسمِ خط اس دور کے ہندوستان کی معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا ایک اہم جزو بن چکا تھا، جس سے ہندوؤں یا مسلمانوں کا صرفِ نظر کرنا بہت مشکل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں نے بھی اس رسمِ خط کو اپنایا۔ [۱۴] اور نہ صرف اردو کے لیے یہ رسمِ خط اختیار کیا گیا، بلکہ دیگر بولیوں کو بھی تحریری جامہ پہنانے کے لیے اس خط کا استعمال ہوا۔ اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو محمد اسحاق صدیقی کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ "جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے

اردو زبان کی ابتدا ہوئی تو ہندو اسے دیوناگری خط میں اور مسلمان فارسی خط میں لکھتے تھے۔[۱۵] بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان آغاز سے لے کر فورٹ ولیم کالج کے قیام (۱۸۰۰ء) تک یہ لوگ اردو (قدیم نام ہندی) کے لیے فارسی رسم خط ہی استعمال کرتے آئے تھے۔ اردو کو دیوناگری حروف میں لکھنے کی 'جدّت' دراصل فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوتی ہے، اور یہیں سے کھڑی بولی پر مبنی 'جدید ہندی' کے ایک علاحدہ زبان کی حیثیت سے قائم ہونے کی تحریک کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ تاہم تمام تر انیسویں صدی کے دوران تعلیم و تعلم، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، خط و کتابت اور سرکاری و غیر سرکاری، نیز دفتری و نجی امور کے لیے شمالی ہندوستان کے ایک بڑے حصے میں زیادہ تر فارسی رسم خط ہی کا استعمال ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں بیسویں صدی کی مختلف قسم کی سماجی، سیاسی اور اصلاحی تحریکوں، نیز اسلام کے علاوہ مذاہب کی تبلیغ و اشاعت کا بہترین وسیلہ بھی یہی رسم خط تھا۔[۱۶]

## ۳

اُردو زبان کے عہد بہ عہد ارتقا، اور اس میں رونما ہونے والی لسانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس کے رسم خط میں بھی ترمیمیں، اضافے اور تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ اردو نے اپنے ارتقا کے دوران چودہ خالص ہندی آوازیں اختیار کیں جو یہ ہیں:

ٹ، ڈ، ڑ، پھ، بھ، تھ، دھ، ٹھ، ڈھ، چھ، جھ، کھ، گھ، ڑھ۔

ان کے علاوہ لھ، مھ، نھ، اور رھ بھی ہیں لیکن ان کا استعمال بہت کم ہے۔ ان آوازوں میں زیادہ تر ہکار (نفسی) اور چند کوز (معکوسی) آوازیں شامل ہیں۔ عربی فارسی رسم خط میں ان آوازوں کی نمایندگی کے لیے نہ تو کوئی حرف مقرر تھا اور نہ کوئی علامت موجود تھی، کیوں کہ یہ آوازیں خالص ہندی ہیں اور عربی یا فارسی

زبانوں میں ان کا قطعی کوئی وجود نہیں۔ فارسی رسم خط جب اردو کے لیے اختیار کیا گیا تو سب سے بڑی دشواری یہی پیش آئی کہ ان آوازوں کو تحریر میں کس طرح ظاہر کیا جائے۔ تین غیر ہکار (غیر نفسی) کوز (معکوسی) آوازوں کے لیے تین نئے حروف ٹ، ڈ اور ڑ وضع کیے گئے جس سے اُردو کے حروفِ تہجی کی تعداد ۳۶ ہو گئی۔ اردو کی چودہ خالص ہندی آوازوں میں سے گیارہ آوازیں ہکار (نفسی) ہیں۔ ان آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے ہائے مخلوط (ھ) کا سہارا لیا جاتا ہے۔ مثلاً پھ، بھ، تھ، دھ وغیرہ۔ ہائے مخلوط کی ترکیب سے وجود میں آنے والے یہ حروف، اردو حروفِ تہجی کا جُزو نہیں سمجھے جاتے اور نہ انھیں علاحدہ یا مستقل حروف کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ کیوں کہ ان کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ یہ دو حروف کا مجموعہ ہیں، لیکن صوتیاتی نقطۂ نظر سے یہ اردو کی منفرد بامعنی آوازیں ہیں جنھیں 'صوتیہ' (PHONEME) کہتے ہیں۔

اُردو کے نظامِ تہجی میں ۳۶ حروف شامل ہیں۔ کچھ لوگ ہمزہ (ء) کو بھی ایک حرف تصوّر کرتے ہیں اور اردو کے حروفِ تہجی کی کل تعداد ۳۷ شمار کرتے ہیں، لیکن فی الحقیقت اردو میں ہمزہ حرف نہیں، علامت ہے اور وہ بھی "علامتِ بے صوت"۔[۱۷]

اردو کے ۳۶ حروف یہ ہیں:

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض
ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی ے

ان میں سے ۳۱ حروف مصمتوں (CONSONANTS) کی نمائندگی کرتے ہیں۔ باقی ماندہ ۵ حروف میں سے ۳ حروف، ا (الف)، ع اور ے خالص مصوتی آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں، جب کہ دو حروف، و (واو) اور ی کی حیثیت نیم مصوتوں (SEMI-VOWELS) کی بھی ہے اور مصوتوں (VOWELS) کی بھی۔[۱۸]

اُردو میں کئی کئی حروف ایک ہی آواز کی نمائندگی کرتے ہیں، مثلاً ث، س اور ص صرف ایک آواز /س/ کو ظاہر کرتے ہیں۔ ذ، ز، ض اور ظ سے بھی صرف ایک ہی آواز /ز/ مراد لی جاتی ہے، نیز ح اور ہ کے لیے بھی ایک ہی آواز /ہ/ مقرر ہے۔ اس طرح اردو کے نظامِ تہجی میں کم از کم سات حروف یعنی ث، ح، ذ، ص، ض، ط اور ظ محض 'بھرتی' کے حروف ہیں۔ بہ قولِ پروفیسر مسعود حسین خاں یہ حروف "ہمارے حروفِ تہجی اور نظامِ درس کے لیے پیرِ تسمہ پا بنے ہوئے ہیں" اور "صوتی نقطۂ نظر سے یہ سب مُردہ لاشیں ہیں، جسے اردو رسم خط اٹھائے ہوئے ہے، صرف اس لیے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے۔"[19]

اُردو نظامِ تہجی میں حروف ث، ح، ص، ض، ط، ظ، ع اور ق عربی الفاظ سے مختص ہیں۔ ص فارسی کے چند الفاظ میں بھی آتا ہے، مثلاً صد وغیرہ۔ خ، ذ، ز اور غ عربی الفاظ میں بھی پائے جاتے ہیں اور فارسی الفاظ میں بھی۔ ژ خالص فارسی الفاظ میں ملتی ہے۔ جب کہ ٹ، ڈ اور ڑ خالص ہندی نژاد الفاظ کے ساتھ مخصوص ہیں۔[20]

۴

ابتدائی دور میں اردو لکھنے کے نہ تو اصول مقرر تھے اور نہ اس کے املا کا کوئی معیار قائم ہوا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ اردو اپنے ارتقائی دور میں تحریری زبان سے زیادہ بول چال کی زبان تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی قدیم تصانیف میں املا کی بے قاعدگیاں جا بہ جا نظر آتی ہیں، مثلاً کربل کتھا[21] (۳۳/۱۷۳۲ء) میں سات کا املا "ثات" (ص ۱۱۵)، ساتویں کا "ثاتویں" (ص ۱۳۲)، نسیں کا "مثیں" (ص ۱۶۲)، اسّی کا "اثی" (ص ۱۶۹) اور ڈھارس کا "ڈھارث" (ص ۱۸۶) لکھا ہوا ملتا ہے۔ اسی طرح کربل کتھا کے بعد کی ایک دوسری تصنیف قصۂ مہر افروز و دلبر[22] (۵۹-۱۷۳۲ء) میں آم کی جگہ "عام" (ص ۴۶) اور تیتر کی جگہ "طیطر" (ص ۱۶۰) لکھا ہے۔ شمالی ہند کی ایک اور

تصنیف وفات نامۂ بی بی فاطمہ[۲۳] (۱۶۹۳ء) میں بیاہ کا املا " بیاح " (ص ۱۱۲) لکھا ہے۔

عربی و فارسی الفاظ کے لکھنے میں بھی بعض اوقات بڑی بے احتیاطی برتی گئی ہے اور ان الفاظ کے روایتی اور اصل املا کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ عاشور نامہ[۲۴] (۱۶۸۸ء) میں اس نوع کی بے قاعدگیاں بہت عام ہیں۔ یاقوت کی جگہ " یعقوت " (ص ۹۹)، زہیر کی جگہ " ظہیر " (ص ۸۵)، بعد کی جگہ " باد " (ص ۱۱۲)، حوّا کی جگہ " ہوا " (ص ۱۴۴)، نعل کی جگہ " نال " (ص ۱۷۵) اور صَفر کی جگہ " سفر " (ص ۳۴۸) اس کی چند مثالیں ہیں۔ اس قسم کی بے قاعدگیاں دیگر تصانیف میں بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً کربل کتھا میں فرات کی جگہ " خراط " (ص ۱۶۸)، بکٹ کہانی[۲۵] (قبل از ۱۶۲۵ء) میں کاغذ کی جگہ " کاگد " (ص ۴۵)، قصۂ مہرافروز و دلبر میں نذر کی " نظر " (ص ۹۵)، مثنوی معجزۂ انار[۲۶] (۱۷۰۸ء) میں صدا کی جگہ " سدا " (ص ۱۶۱)، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ[۲۷] (۳۵-۱۴۲۱ء) میں قانون کی جگہ " کانون " (ص ۱۷۳) اور ابراہیم نامہ[۲۸] (۱۲/۱۶۱۱ء) میں مضمون کی جگہ " مزمون " (ص ۱۸) وغیرہ۔

املا کی بے قاعدگی سے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اُردو کے قدیم مصنفین الفاظ کو جس طرح بولتے تھے اسی طرح لکھتے بھی تھے۔ صوتی املا کو عربی و فارسی کے اصل اور روایتی املا پر ترجیح دینے کی غالباً یہی ایک اہم وجہ ہو سکتی ہے، لیکن بعض اوقات کاتب کی کم سوادی اور جہل کا بھی اس میں خاصا دخل ہوتا ہے، جیسا کہ عاشور نامہ کے ساتھ ہوا۔ بہ قولِ پروفیسر مسعود حسین خاں " عاشور نامہ کا کاتب کم سواد بلکہ کسی حد تک جاہل ہے وہ نہ صرف ہندی الفاظ کے املا میں توڑ مروڑ پیدا کرتا ہے، اکثر اوقات عربی فارسی کے معروف اور مستند الفاظ تک ٹھیک سے نہیں لکھتا "[۲۹] مولوی عبدالحق نے قطب مشتری[۳۰] (۱۰/۱۶۰۹ء) کے " مقدمہ " میں ایسے بہت سے الفاظ دیے ہیں جنھیں

دکنی مصنفین نے ان کے اصل املا کے مطابق نہیں لکھا ہے، مثلاً ملمّا (ملمع)، اخل (عقل)، صفے (صفحے)، وخت (وقت)، منا (منع)، ستید (مستعد)، نفا (نفع)، وضا (وضع)، ملاذا (ملاحظہ) وغیرہ۔[۳۱]

اٹھارہویں صدی کے وسط میں شاہ ظہور الدین حاتم (۱۶۹۹ - ۱۷۸۱ء) کے ہاتھوں جب اردو میں اصلاحِ زبان کی تحریک کا آغاز ہوا تو الفاظ کو عربی فارسی املا کے مطابق لکھنے کا رواج عام ہونے لگا اور "دوانہ"، "بگانہ"، "صحی" اور "تسبی" جیسے الفاظ کو ان کے صحیح املا کے مطابق علی الترتیب دیوانہ، بیگانہ، صحیح اور تسبیح لکھا جانے لگا۔

۵

اگر الفاظ کا املا درست نہ ہو تو ان کے تلفّظ میں بعض اوقات بڑی دشواری پیش آتی ہے، نیز خلطِ مبحث کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ اگرچہ ک اور گ اردو کے دو علاحدہ حروف ہیں اور ان سے دو الگ الگ بامعنی آوازیں ظاہر کی جاتی ہیں۔ تاہم ان کے لکھنے میں بڑی بے قاعدگی برتی جاتی رہی ہے۔ اردو کی قدیم تصانیف میں عام طور پر ک اور گ کے امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ ابتدائی دور میں اور اس کے بعد بھی /گ/ کی آواز کو ک اور گ دونوں سے ظاہر کیا جاتا رہا ہے۔ بعض اوقات /ک/ اور /گ/ دونوں آوازوں کے لیے صرف ک (ایک مرکز کے ساتھ) استعمال کیا گیا ہے۔ ک کی جگہ گ لکھنے کی مثالیں بھی پائی گئی ہیں۔ تحریری اعتبار سے ک اور گ میں فرق صرف مرکز کی کمی اور بیشی کا ہے۔ قدیم اردو کے بے شمار مخطوطات ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن میں ک اور گ پر مقررہ تعداد میں مرکز بنانے کا التزام نہیں پایا جاتا۔ یہ بے قاعدگی غالب (۱۷۹۷ - ۱۸۶۹ء) تک کے یہاں پائی جاتی ہے۔

قدیم اردو مخطوطات کے مطالعے سے ذیل کے انکشافات سامنے آتے ہیں:

(۱) مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (۱۴۲۱-۳۵ء) میں گ کے لیے ک لکھ کر اس کے نیچے تین نقطے لگائے گئے ہیں، مثلاً "ناکینی" (ناگنی)۔ لیکن یہ اصول بھی یکسانیت کے ساتھ نہیں برتا گیا ہے۔[۳۲]

(۲) ابراہیم نامہ (۱۶۱۱/۱۲ء) میں "ک اور گ دونوں میں کاتب ایک ہی مرکز لگاتا ہے، مثلاً کیان (گیان)، جکت (جگت)۔"[۳۳]

(۳) عاشور نامہ (۱۶۸۸ء) کا کاتب "ک اور گ کے امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھتا۔"[۳۴]

(۴) مثنوی معجزۂ انار (۱۷۰۸ء) میں "ک، گ کا کوئی التزام نہیں ہے کہیں ک کو گ لکھا گیا ہے اور کہیں گ کو ک۔"[۳۵]

(۵) دیوانِ فائز (۱۷۱۴/۱۵ء)[۳۶] میں "گاف پر ہمیشہ ایک ہی مرکز لگایا گیا ہے۔"[۳۷]

(۶) کربل کتھا (۱۷۳۲/۳۳ء) میں "ک اور گ میں فرق نہیں کیا گیا ہے یعنی 'گ' پر دوسرا مرکز موجود نہیں ہے۔"[۳۸]

کربل کتھا کے مخطوطے کا ایک اقتباس یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے، جس میں ک اور گ دونوں کے لیے ایک ہی مرکز بنایا گیا ہے:

بچیکی اوس کل تن سی وو جیسی کل کی بو کئی یو روح نکل رہ کیا وو کل بن بو
پدر سی اپنی عدن بیچ جا ملی خوش ہو پدر لی بوسی دہاں جھاتی سی لکاتا ہی

اس اقتباس کو مرتبین نے تدوینِ متن کے وقت یوں لکھا ہے:

بچی کے اُس گلِ تن سے وُو جیسے گل کی بو
گئی یو روح نکل رہ گیا وُو گل بن بُو
پدر سے اپنے عدن بیچ جا ملی خوش ہو
پدر لے بوسے دہاں چھاتی سے لگاتا ہے[۳۹]

مذکورہ اقتباس میں گ پر صرف ایک مرکز لگایا گیا ہے، مثلاً "کل" (گل)، "کئی"

"ر گئی)، "کیا" (گیا)، اور "لکاتا" (لگاتا) ک پر بھی ایک مرکز ہے مثلاً "کی"، "نکل" وغیرہ۔

اردو میں ک اور گ کے امتیاز کو انیسویں صدی کے وسط تک نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس کا ثبوت اس دور کے خوش نویسوں اور کاتبوں کی تحریر شدہ وہ بے شمار وصلیاں ہیں جو دست بُردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں۔ ایسی ہی ایک وصلی سید محمد امیر رضوی عرف میر پنجہ کش کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جس کا عکس مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی نے اپنی تصنیف صحیفۂ خوش نویساں (علی گڑھ، ۱۹۶۲ء) میں شائع کیا ہے۔ میر پنجہ کش بہادر شاہ ظفر کے دور کے ایک مشہور خوش نویس گذرے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس دور میں شمالی ہند میں جو شہرت و مقبولیت ان کے خط کو حاصل تھی وہ کسی اور کے خط کو حاصل نہیں تھی۔ انھوں نے ایک وصلی پر جو دو شعر درج کیے ہیں وہ بجنسہٖ یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ اس سے اس دور کی طرزِ کتابت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے:

میر معذور ہو کئی افسوس
بزم سی دور ہو کئی افسوس
عیشمیں ساری عمر خوب کٹی
ابتو رنجور ہو کئی افسوس[۱۵]

ان اشعار میں ک اور گ دونوں پر ایک ہی مرکز بنایا گیا ہے، مثلاً "کٹی" (کٹی)، اور "کئی" (گئی)۔

دہلی کے ایک اور خوش نویس منشی رحیم اللہ کی ۱۳۰۱ھ (۸۴/۱۸۸۳ء) کی تحریر شدہ ایک وصلی میں بھی گ پر صرف ایک مرکز بنایا گیا ہے ؏

مَیں مست کئی تو صورت مستی نظر پڑے[۱۶]

یہاں گ کی جگہ ک لکھا ہے، یعنی "کئی" (گئی)۔

اسی طرح خطوطِ غالب کے عکس سے پتا چلتا ہے کہ غالب نے اپنی تحریروں میں کہیں کہیں گ پر صرف ایک مرکز اور ک پر دو مرکز بنائے ہیں۔ پرتھوی چند نے مرقعِ غالب (دہلی، ۱۹۶۶ء) کے نام سے غالب کے ان خطوط کے عکس شائع کر دیے ہیں جو انھوں نے والیانِ رام پور (نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں) کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط کے چند اقتباسات یہاں بجنسہٖ نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) نوشتہ ۸ر دسمبر ۱۸۵۹ء:

"میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا تم سے نگھون تو کس سے کہون؟"

نہ کہوں

(۲) نوشتہ ۱۷ر اکتوبر ۱۸۶۶ء:

"آشیان ساختن و بستن و چیدن کہونسلا بنانیکے معنے پر ہے؟"

گھونسلا

(۳) نوشتہ ۲۷ر جولائی سالِ حال (۱۸۶۶ء):

"میرا مردہ بے گور و کفن نرہیگا؟"

نہ رہے گا

(۴) نوشتہ ۱۱ر نومبر ۱۸۶۱ء:

اس مرض مین اوس سے گریز نہین تپ نے آکہیرا۔"

گھیرا

یہاں "نگھون" (نہ کہوں) میں ک پر دو مرکز بنائے گئے ہیں۔ اس کے برعکس "کہونسلا" (گھونسلا)، "نرہیگا" (نہ رہے گا) اور "کہیرا" (گھیرا) میں گ پر صرف ایک مرکز بنا ہے۔ غالب کے یہاں اس قسم کی بے قاعدگی ضرور پائی جاتی ہے لیکن یہ بہت عام نہیں ہے کیوں کہ غالب نے زیادہ تر مقامات پر ک پر ایک مرکز اور گ پر دو

مرکز بنائے ہیں[۴۲]

اردو مخطوطوں اور تحریروں کے تاریخ وار مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ک اور گ میں صحیح معنوں میں امتیاز کہیں انیسویں صدی کے آخر میں جا کر قائم ہو سکا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ک پر ایک مرکز اور گ پر دو مرکز بنائے جانے کا پورا اہتمام پایا جاتا ہے۔

۶

اسی طرح یائے معروف (ی) اور یائے مجہول (ے) کے لکھنے میں بھی بڑی بے قاعدگی اور بے امتیازی برتی گئی ہے۔ اردو میں ی اور ے دو مستقل حروف ہیں اور ان سے دو نمایاں آوازوں کے اظہار کا کام لیا جاتا ہے۔ قواعد کی رُو سے بھی ان دونوں میں تانیث و تذکیر کا نمایاں فرق موجود ہے، مثلاً لڑکی/لڑکے، بڑی/بڑے، گئی/گئے، کھی/کھتے وغیرہ۔ عربی اور فارسی زبانوں میں ی اور ے میں وہ امتیاز نہیں پایا جاتا جو اردو میں ہے۔ عربی حروفِ تہجی میں صرف ی شامل ہے، اور ے اسی ی کی متغیر شکل ہے۔ عربی میں ی اور ے کے تبادل سے معنی میں تبدیلی نہیں پیدا ہوتی اور نہ تلفظ ہی میں فرق آتا ہے، مثلاً عربی میں علی کو علی اور علے دونوں طرح سے لکھ سکتے ہیں۔ دونوں کا تلفظ یکساں ہوگا۔ فارسی میں بھی صرف یائے معروف پائی جاتی ہے۔ یائے مجہول کا وجود جدید فارسی میں ناپید ہو چکا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یائے مجہول پہلے فارسی لہجے میں موجود تھی[۴۳]۔

عربی اور فارسی کی طرح اردو میں بھی ی اور ے کے امتیاز کو ملحوظ نہ رکھنے کا رجحان عام رہا ہے اور کافی حد تک بے قاعدگی برتی جاتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات الفاظ کی تذکیر و تانیث کے تعین میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے الفاظ کے بارے میں یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کسی مصنف نے انھیں مذکر استعمال کیا ہے یا مونث۔ اردو کے جن محققین نے قدیم مخطوطات کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیا ہے

انھوں نے ایسے مقامات پر بالعموم قیاس آرائی اور سیاق و سباق سے کام لیا ہے، کیوں کہ قدیم اردو مخطوطات میں ی اور ے کی تفریق قطعی نہیں پائی جاتی۔ ان مخطوطات میں ی کی جگہ ے اور ے کی جگہ ی لکھنے کی مثالیں جا بہ جا ملتی ہیں۔ کہیں ی اور ے دونوں کی جگہ صرف ی سے کام نکالا گیا ہے تو کہیں ان کی جگہ صرف ے ملتی ہے۔ اس قسم کی بے قاعدگی ہر قدیم مخطوطے اور ہر پرانی تحریر میں ضرور پائی جاتی ہے۔ غالب کی تحریروں میں بھی یہ بے قاعدگی اتنی ہی عام ہے جتنی کسی اور قدیم تحریر میں۔

ذیل میں ی اور ے کے استعمال میں بے قاعدگی سے متعلق چند قدیم مخطوطات کے مرتبین کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں " یائے معروف و مجہول میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا۔"[۲۷]

(۲) ابراہیم نامہ میں " یائے معروف اور یائے مجہول کے اختلاط کی مثالیں تو ہر ہر صفحے پر مل جائیں گی۔"[۲۸]

(۳) عاشور نامہ کا کاتب " یائے معروف اور مجہول میں امتیاز نہیں کرتا۔ مثالیں ہر صفحے پر کثرت سے پائی جاتی ہیں۔"[۲۹]

(۴) مثنوی معجزۂ انار میں " ی اور ے میں بھی کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا ہے۔ دونوں کو عموماً 'ی' کی کشش سے لکھا ہے جو نیم عربی رسم الخط کہا جا سکتا ہے۔"[۳۰]

(۵) کربل کتھا میں " یائے معروف اور یائے مجہول میں امتیاز نہیں، تقریباً ہر جگہ ایک کی بجائے دوسری ملتی ہے۔"[۳۱]

(۶) دیوانِ فائز میں " معروف اور مجہول ے میں امتیاز نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً "کی" (کے)، "ہی" (رہے)، "مجی" (مجھے)۔"[۳۲]

(۷) قصۂ مہر افروز و دلبر میں " کاتب یائے معروف اور یائے مجہول میں امتیاز

نہیں کرتا۔ عام طور پر یائے معروف کو یائے مجہول لکھا ہے۔ صرف بعض مقامات اس سے مستثنیٰ ہیں۔[۲۵]

ذیل میں کربل کتھا اور قصۂ مہر افروز و دلبر کے مخطوطات کی دو عبارات یہاں بجنسہٖ نقل کی جاتی ہیں جن سے یائے معروف اور یائے مجہول کی بے قاعدگیوں کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کربل کتھا میں یائے معروف اور یائے مجہول دونوں کی جگہ صرف یائے معروف ملتی ہے۔ اس کے برعکس قصۂ مہر افروز و دلبر میں یائے معروف اور یائے مجہول دونوں کی جگہ یائے مجہول کا استعمال بہت عام ہے:

(۱) "اور روایت ہی کہ اوس ملعون نی اہلبیت کی سفر کا اسباب تیار کر نعمان بشیر

ہے نے کے

کون تیس[۳۰] سوار سی مقرر کیا۔"

سے

(کربل کتھا، پانچویں فصل)

(۲) "کوئے ایسا نتہا کہ کسے بات سے محتاج ہوی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عید اور شادی

کوئی کسی ہوئے

نہ معلوم ہوتے تھے، کیونکہ عید اور شادی رات دن رہتے تھے۔"

ہوتی تھی رہتی تھی

(قصۂ مہر افروز و دلبر کے پہلے صفحے سے)

غالب کی تحریروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر تک اردو میں یائے معروف اور یائے مجہول کے درمیان امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ مرقع غالب (دہلی، ۱۹۶۹ء) کے ذیل کے عکسِ خطوط سے غالب کے یہاں اس قسم کی بے قاعدگی کی بہت واضح تصویر سامنے آجاتی ہے:

(۱) نوشتہ ۸ ر نومبر ۱۸۶۵ء:

"حضور جو پانی ہمیشہ پیتی تہی وہی پیتی ہونگی"

پیتے تھے پیتے ہوں گے

(۲) نوشتہ یکم ستمبر ۱۸۶۶ء:

"برسات ایسے ہوئے ہی کہ"

ایسی ہوئی ہے

(۳) نوشتہ ۲۶ ر جنوری ۱۸۶۷ء:

"اخبار انگریزے دیکہا کرتا ہی اوسنے مجہسی بیان کیا کہ"

انگریزی ہے مجھ سے

(۴) نوشتہ ۱۵ ر فروری ۱۸۶۷ء:

"کہ پہر کلکتی کو تشریف لیجائیگا یا نہیں"

کلکتے

(۵) نوشتہ ۱۹ ر اگست ۱۸۶۷ء:

"حسین علیخان کے منگنے ہو گئے اور اپنی کنبی مین ہوئے یعنے

کی منگنی ہو گئی اپنے کنبے ہوئی یعنی

نواب احمد بخشخان مرحوم کے حقیقی بہائے کے پوتے سے"

بھائی کی پوتی

غالب کے یہاں اس بے قاعدگی کے متعلق مولانا امتیاز علی خاں عرشی مقدمۂ مکاتیب غالب میں لکھتے ہیں:

"معروف کی جگہ مجہول اور مجہول کی معروف "ی" کا استعمال ان کے یہاں اتنا عام ہے کہ بعض اوقات پڑھنے میں دقت اور تذکیر و تانیث کے متعین کرنے

میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔[۵۱]

امتیاز علی عرشی نے غالب کے متعلق ایک دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ ـــــ

"وہ اپنے عہد کا طرزِ کتابت کے مطابق یاے معروف و مجہول کے لکھنے میں بول چال سے زیادہ خطی خوش نمائی اور کاغذ پر باقی ماندہ جگہ کا لحاظ کرتے تھے۔"[۵۲]

یاے معروف اور یاے مجہول میں امتیاز بیسویں صدی کے اوائل تک قائم نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا ثبوت بیسوی صدی کے عشرۂ دوم کی ایک دستی تحریر، 'بیٹی کا خط ماں کے نام' ہے جس کا عکس جارج گریرسن نے اپنے لسانیاتی جائزۂ ہند (۱۹۱۶ء) میں "لکھنؤ کی بیگماتی اردو" کے نمونے کے طور پر شامل کیا ہے۔ اس خط کا ایک اقتباس بجنسہٖ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"وہ تو کہیے بڑی خیریت گذری آدمی ڈیوڑھے پر موجود تھا اوسنے روکا تھا ما نہین توسب کا سامنا ہوجاتا۔۔۔ ذرا ذرا سی بات پر تو تومین مین ہونے لگتے ھے ۔۔۔ میان کو مرے پورے چار مہینہ بھے نہین ہوے تھے کہ آسمان پھٹ پڑا۔ غریب کے رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی۔"[۵۳]

یہاں "ڈیوڑھے" (ڈیوڑھی)، "لگتے ہے" (لگتی ہے)، "بھے" (بھی)، "کے" (کی) میں یاے معروف کی بجاے یاے مجہول استعمال کی گئی ہے۔

کچھ پیشہ ور خوش نویسوں اور کاتبوں نے بیسویں صدی کے وسط میں بھی اُسی پُرانی روش اور قدیم طرزِ کتابت کو برقرار رکھا ہے۔ جے پور کے منشی رام چندر نامی ایک کاتب نے ایک وصلی پر ۱۹۴۱ء میں ایک شعر کی کتابت میں یاے معروف اور یاے مجہول دونوں کے لیے صرف یاے معروف استعمال کی ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

جدا کسی سی کسی کا غرض حبیب نہو
یہہ داغ وہ ہی کہ دشمنکو بھی نصیب نہو[۵۴]

یہاں "سی" (سے) اور "ہی" (ہے) میں ے کی جگہ ی استعمال کی گئی ہے۔

۷

ھائے مخلوط جسے دوچشمی ھ بھی کہتے ہیں اور ہائے غیر مخلوط یعنی سادہ ہ کے استعمال میں بھی بے قاعدگیاں کچھ کم نہیں ہیں۔ قدیم اردو مخطوطات میں ہ کی جگہ ھ، اور ھ کی جگہ ہ کا استعمال بہت عام رہا ہے۔ اردو کے نظامِ ہجی میں ہ (ہائے ہوز) کو ایک باقاعدہ اور مستقل حرف کی حیثیت حاصل ہے، جب کہ دوچشمی ھ اردو کا کوئی حرف نہیں۔ اردو میں اس کی حیثیت محض ایک علامت کی ہے جس سے آوازوں کی ہکاریت (نفسیت) کو ظاہر کرنے کا کام لیا جاتا ہے، مثلاً پھ، بھ، کھ، دھ وغیرہ۔ دیگر تحریری علامات کی طرح یہ علامت بھی عربی سے آئی ہے، لیکن عربی میں اسے نہ تو حرف کا درجہ حاصل تھا اور نہ اس سے ہکاریت (نفسیت) کے اظہار کا کام لیا جاتا تھا کہ ہکاریت نہ تو عربی میں پائی جاتی ہے اور نہ فارسی میں۔ یہ خالص ہندوستانی زبانوں کی صوتیاتی خصوصیات میں سے ہے۔ جس طرح عربی اور فارسی میں ی اور ے میں کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا اسی طرح ان زبانوں میں ہ اور ھ میں بھی صوتی یا معنیاتی اعتبار سے کوئی فرق موجود نہیں ہے۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہ کی آواز کے لیے ہ اور ھ دونوں صورتوں کا یکساں طور پر استعمال ہوتا رہا ہے، کیوں کہ ہ اور ھ کے تبادل سے ان زبانوں میں معنیاتی امتیاز پیدا نہیں ہوتا۔ جب کہ اردو میں ہ کو ھ سے یا ھ کو ہ سے بدلنے پر معنی میں بھی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً کہار/کھا، پہاڑ/پھاڑ، بہلانا/بھلانا، یا گھر/گہر، دھان/دہان، پھر/پہر وغیرہ۔

چوں کہ عربی اور فارسی میں ہکار (نفسی) آوازوں کا یکسر وجود ہی نہیں تھا اس لیے تحریر میں ان کی نمائندگی کے لیے نہ تو کوئی حرف مقرر تھا اور نہ کوئی علامت۔ اسی لیے ابتدا میں اردو کی ہکار آوازوں کی تحریر میں نمائندگی کی جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

جس طرح عربی فارسی میں ہ کی آواز کے لیے ہ اور ھ دونوں صورتوں کا یکساں طور پر استعمال ہوتا آیا تھا اسی طرح اردو میں ہ کی آواز کے لیے ہ اور ھ دونوں کا بلا امتیاز استعمال ہوتا رہا، لیکن اردو میں یہ بے امتیازی دراصل تحریر کی بے قاعدگی تھی جو عربی فارسی طرزِ کتابت کے اثر سے اردو میں رائج ہو گئی تھی۔ شمال و دکن کے تمام تر قدیم مخطوطات میں یہ بے قاعدگی حد درجہ عام ہے۔ اس بے قاعدگی یا بے امتیازی کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ چوں کہ دکنی مخطوطات زیادہ تر خطِ نسخ میں ہیں، اسی لیے ان میں ھ کا استعمال زیادہ پایا جاتا ہے۔ دکنی مخطوطات میں ہ اور ھ دونوں کی جگہ زیادہ تر ھ کا ہی استعمال ہوا ہے، لیکن کہیں کہیں ھ کی جگہ ہ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (نظامی بیدری)، ابراہیم نامہ (عبدل دہلوی) اور دیگر دکنی مخطوطات میں اس نوع کی مثالیں تقریباً ہر صفحے پر موجود ہیں، جیسے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں "ھم" (ہم)، "ھمن" (ہمن)، "ھوا" (ہوا)، "بھت" (بہت)، "کھیا" (کہیا)، "دو پھر" (دوپہر)، "کھے" (کہے)، اور ابراہیم نامہ میں "الھی" (الہٰی)، "بھاکر" (بہاکر)، "کھوں" (کہوں) وغیرہ الفاظ۔

دکن کے برخلاف شمالی ہند میں ہ اور ھ کی جگہ ہ کا استعمال زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ یہاں خطِ نسخ کے بجائے خطِ نستعلیق کا چلن زیادہ تھا، چنانچہ کربل کتھا، قصۂ مہر افروز و دلبر اور دوسرے بہت سے مخطوطات میں یہی طرزِ کتابت اختیار کی گئی ہے۔ ان مخطوطوں میں ھ کی مثال ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ کربل کتھا کے مخطوطے کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں: "کہر" (گھر)، "دہوم" (دھوم)، "ایدہر" (ایدھر)، "اودہر" (اودھر)، "تہیں" (تھیں)، "پہو پہیاں" (پھوپھیاں)، "تہی" (تھی)، "پہر" (پھر)۔ اسی طرح قصۂ مہر افروز و دلبر کے مخطوطے میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں: "تہا" (تھا)، "تہے" (تھے)، "چہوٹا" (چھوٹا)، وغیرہ۔

غالبؔ نے بھی اگرچہ اپنی تحریروں میں ہ اور ھ کے امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا ہے لیکن ان کی تحریروں میں ہ اور ھ دونوں کی جگہ ہ کا استعمال حد درجہ عام ہے۔ ہ کی جگہ ھ کا استعمال ان کے یہاں خال خال نظر آتا ہے۔ صرف چند مقامات پر ابتدائی حالت میں انھوں نے ہ کی جگہ ھ استعمال کی ہے، مثلاً "ھی" (رہے) وغیرہ۔ غالبؔ کے خطوط سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) نوشتہ ۱۷ر نومبر ۱۸۵۸ء:

"آگی تنگدست تہا اب تہیدست ہوگیا ہوں"

تھا

(۲) نوشتہ ۱۵ر ستمبر ۱۸۶۲ء:

"ایک ورق پر لکہہ کر صبحکو ڈاکمین بہجوا دیا"

لکھ بھجوا

(۳) نوشتہ ۸ر نومبر ۱۸۶۴ء:

"گہر مین روٹی نہین پکی ہم سب نے فاقہ کیا"

گھر

(۴) نوشتہ ۲۷ر نومبر ۱۸۶۴ء:

"یہ ہفتہ عشرہ کس تردد و تشویش سی بسر ہوا ھی"

ہے

(۵) نوشتہ ۱۵ر فروری ۱۸۶۶ء:

"مین نے حضور کا خط اوسے دکہا دیا"

دکھا

(۶) نوشتہ ۱۷؍اکتوبر ۱۸۶۶ء:

"میری طبیعت کو زبان فارسی سی ایک لگاؤ تہا چاہتا تہا کہ فرہنگونسی بڑہ کر
بڑھ تھا تھا

کوئی ماخذ مجکو ملی۔"

ہ اور ھ میں امتیاز انیسویں صدی کے آخر تک ضروری خیال نہیں کیا گیا تھا۔[۵۵] عام خیال یہ ہے کہ "بیسویں صدی کے شروع سے اس طرف توجہ مبذول ہونا شروع ہوئی"۔ بیسویں صدی کے عشرۂ دوم کی ایک دستی تحریر کا عکس معیاری اردو کے نمونے کے طور پر جارج گریرسن نے اپنے لسانیاتی جائزۂ ہند (۱۹۱۶ء) میں پیش کیا ہے، جس میں ہکار آوازوں کے لیے ھ کے اتصال سے تشکیل پانے والے حروف کی تعداد بہت ہی کم ہے، جب کہ ہکار آوازوں کی نمائندگی کے لیے ہ کا استعمال بہ کثرت ملتا ہے۔ اس تحریر میں کہیں کہیں ہ کی جگہ ھ کا استعمال بھی پایا جاتا ہے، مثلاً:

"ایک شخص کے دو بیٹے تہے۔ ان مین چہوٹا باپ سے کہنے لگا۔۔۔۔۔ اور چند
تھے چھوٹا

ہی روز بعد چہوٹا بیٹا سب مال اکہٹا کر کے بہت دور کے ملک مین چلا گیا
اکھٹا چھوٹا

۔۔۔۔۔۔ اوس وقت اوس کا بڑا بیٹا کہیت پر تہا۔"[۵۶]
کھیت تھا

بیسویں صدی کے وسط تک کی بعض تحریروں میں بھی اس قسم کی بے امتیازی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ جے پور کے کاتب منشی رام چند رکی ۱۹۴۱ء کی تحریر شدہ جس وصلی کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے اس میں بھی کی جگہ "بہی" لکھا ہوا ہے۔ لہٰذا بلا خوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ھ کے اتصال سے تشکیل شدہ صورتوں مثلاً بھ، پھ، تھ، دھ، کھ، گھ وغیرہ کا ہکا

آوازوں کی نمائندگی کے لیے باقاعدہ استعمال پچھلے چند دہوں ہی سے ہونا شروع ہوا ہے۔

۸

**۱** اردو کی تین کوز (معکوسی) آوازوں /ٹ/ /ڈ/ اور /ڑ/، اور ان کی ہکار صورتوں /ٹھ/، /ڈھ/، اور /ڑھ/ کو اردو رسم خط میں ظاہر کرنے کا تاریخ وار مطالعہ بھی بے حد دلچسپ ہے۔ ان آوازوں کی تحریری صورتوں میں وقتاً فوقتاً بے شمار تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ہکار آوازوں کی طرح /ٹ/، /ڈ/، /ڑ/ بھی خالص ہندی آوازیں ہیں۔ عربی اور فارسی زبانوں سے ان کا دور کا بھی رشتہ نہیں۔ اردو کے لیے جب فارسی رسم خط اختیار کیا گیا تو ان آوازوں کو تحریری روپ دینے کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ ان آوازوں کے لیے اردو میں علاحدہ حروف وضع کرنے کے بجائے موجودہ حروف تؔ، دؔ، رؔ ہی کو ان آوازوں کی نمائندگی کے لیے اختیار کر لیا گیا۔ صرف ان کے ناموں میں ضرور تبدیلی پیدا کی گئی یعنی کوز آوازوں /ٹ، ڈ، ڑ/ کی نمائندگی کرنے والے حروف تؔ، دؔ، رؔ کو علی الترتیب تائے ہندی، دالِ ہندی اور رائے ہندی کے نام سے یاد کیا گیا۔ دکنی تصنیف مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں کوز آوازوں /ٹ، ڈ، ڑ/ کے لیے علی الترتیب تؔ، دؔ، رؔ ہی کا استعمال ہوا ہے، مثلاً "چھوتا" (چھوٹا)، "دور" (دوڑ)، "ٹھار" (ٹھاں)، "چوت" (چوٹ)، "کھرا" (کھڑا)، "پکر" (پکڑ) وغیرہ۔ اس مخطوطے میں /ڈ/ اور /ڑ/ کی نمائندگی کے لیے کہیں کہیں دؔ کے نیچے تین نقطے بھی لگا دیے گئے ہیں مثلاً "ڈر" (ڈر)، "موڑ" (موڑ)، "بڑا" (بڑا) وغیرہ۔

ایک دوسری دکنی تصنیف ابراہیم نامہ کے مخطوطے میں بھی بالکل یہی صورتِ حال پائی جاتی ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں جو ابراہیم نامہ کے مرتب ہیں اس کے کاتب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ڈ اور ڑ دونوں کو د کے نیچے تین نقطے لگا کر ظاہر کرتا ہے۔ کبھی کبھی ڑ
کو صرف ز لکھتا ہے۔"[۵۶]

شمالی ہند کے بعض قدیم مخطوطات میں بھی ٹ کی جگہ ت، ڈ کی جگہ د اور ڑ کی جگہ ر کا استعمال ملتا ہے، لیکن یہاں ان کی کچھ اور صورتوں کا بھی ارتقا عمل میں آیا ہے، مثلاً خالق باری (۱۶۲۱ء) میں ٹ، ڈ، ڑ کے لیے چار نقطوں کا استعمال ہوا ہے، لیکن ٹ کے لیے چار نقطوں کا استعمال حرف کے اوپر اور ڈ اور ڑ کے لیے چار نقطوں کا استعمال عام طور پر حرف کے نیچے ہوا ہے، مثلاً ت، د اور ر۔ کربل کتھا کے مخطوطے میں چار نقطوں کے بجائے تین نقطے استعمال ہوئے ہیں اور یہ نقطے ہر جگہ حروف کے اوپر بنائے گئے ہیں مثلاً "اوتھا" (اٹھا)، "ہونت" (ہونٹ)، "درتا" (ڈرتا)، "چمت" (چمٹ)، "اوڑاتین" (اٹھائیں)، "پتر" (پڑ) وغیرہ۔ کربل کتھا کے بعد کی نثری تصنیف قصۂ مہر افروز و دلبر میں ٹ، ڈ کے لیے پھر چار نقطے والے حروف ملتے ہیں، مثلاً "چھوتا" (چھوٹا)، "بدا" (بڑا)، وغیرہ۔ ڑ کے لیے چار نقطوں کا استعمال عاشور نامہ میں بھی ملتا ہے۔

بعض قدیم مخطوطات میں ت، د، ر کے چار نقطوں میں سے اوپر کے دو نقطوں کو آپس میں ڈیش (ـ) کی صورت میں ملا دیا گیا، جس سے ان کی شکلیں ت، د، ر ہو گئیں۔ اس کے بعد آگے چل کر ڈیش کے نیچے والے دونوں نقطوں کو بھی آپس میں ملا دیا گیا یعنی ت، د، ر۔ پھر مزید سہولت کی خاطر ایک ڈیش (ـ) کو ختم کر کے ان کی صورت ت، د، ر کر دی گئی۔ قصۂ مہر افروز و دلبر میں چار نقطوں کے علاوہ ڈ پر کہیں کہیں ایک اور کہیں دو ڈیش بنائے گئے ہیں مثلاً د یا د۔ ۱۸۰۰ عیسوی میں کلکتے میں جب فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو اس کے مطبع سے کوز آواز دینے کے لیے حروف پر چھوٹی طوئے (ط) کا استعمال شروع ہوا۔[۵۷] ۱۸۰۰ء کے بعد کی تحریروں میں کہیں طوئے کا استعمال ملتا ہے اور کہیں چار نقطوں کا۔ بعض مخطوطات میں دو نقطے اور چھوٹی طوئے ساتھ ساتھ

پائی جاتی ہے۔ ۱۸۰۰ء سے قبل کی کسی تحریر میں طوئے کا استعمال نہیں دیکھا گیا ہے۔

مرزا اسداللہ غالب تا دم مرگ (۱۸۶۹ء) ڈ اور ڑ کے لیے چھوٹی طوئے اور ٹ کے لیے چار نقطوں کا استعمال کرتے رہے ہیں۔[۵۹] ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط کے چند اقتباسات یہاں بجنسہٖ نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) نوشتہ ۲۴ر ستمبر ۱۸۶۶ء:

"اس غریب کا مجموعۂ نظم و نثر غدر مین لُٹ گیا۔"

لُٹ

(۲) نوشتہ ۱۸ر اکتوبر ۱۸۶۷ء:

"مگر یہ بڑی بات ہے۔"

بڑی

(۳) نوشتہ ۱۷ر ستمبر ۱۸۶۸ء:

"حسین علیخان کے سسرال والون کا بڑا تقاضہ ہے۔"

بڑا

(۴) نوشتہ ۲۶ر دسمبر ۱۸۶۴ء:

"ایک تھلیا مین رکھ کر آٹے سے منہ بند کیا پھر کپڑا لپیٹا۔"

ٹھلیا آٹے کپڑا لپیٹا

(۵) نوشتہ ۱۷ر دسمبر ۱۸۶۸ء:

"آٹھ سو روپئے مین میرا قرض تمام ادا ہو جائیگا۔"

آٹھ

(۶) نوشتہ ۱۸ر ستمبر ۱۸۶۶ء:

"دعا کیواسطے تقریب ڈھونڈھتا ہون۔"

ڈھونڈھتا

(۷) نوشتہ ۱۰؍اپریل ۱۸۵۹ء:

" صبح کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا:

ڈاک

جیسا کہ مذکورہ مثالوں سے ظاہر ہے غالب نے ٹ اور ٹھ کے لیے ہر جگہ چار نقطے استعمال کیے ہیں اور دوسری کوز آوازوں کے لیے چھوٹی طوئے (ط) استعمال کی ہے، لیکن غالب کے ایک ہم عصر خوش نویس میر پنجہ کش (جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے) نے ٹ کے لیے دو نقطے استعمال کیے ہیں اور طوئے بھی، یعنی ٹ۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کے ایک مشہور اردو قواعد نویس جان ٹی۔ پلیٹس (۱۸۳۰-۱۹۰۴ء) کا خیال ہے کہ اردو کی جو کتابیں ہندوستان میں چھپتی ہیں ان میں کوز آوازوں کے لیے بالعموم (ط) کا استعمال پایا جاتا ہے، لیکن انگلستان میں چھپی کتابوں میں چار نقطوں والی صورت ٹ ہی مُرجح ہے۔[۶۰]

۹

اردو کے قدیم مخطوطوں اور پرانی تحریروں میں بعض حروف کے نقطوں سے متعلق بھی ایک طرح کی غیر یکسانیت عام رہی ہے، بالخصوص پ، چ اور ژ پر تین نقطے بنانے کا التزام قدیم طرزِ کتابت میں کم پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ایرانیوں نے جب عربی رسم خط فارسی زبان کے لیے اختیار کیا تو اس میں چار نئے حروف پ، چ، ژ اور گ کا اضافہ کیا۔ ان میں سے اوّل الذکر تین حروف عربی کے ب، ج اور ز پر دو نقطوں کے اضافے سے وضع کیے گئے تھے۔ اسی لیے انھیں علی الترتیب بائے فارسی، جیم فارسی اور زائے فارسی کہا گیا۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے مخطوطے میں پ اور چ کے لیے بیک وقت ایک اور تین نقطوں کا استعمال پایا جاتا ہے، یعنی بیشتر مقامات پر ان حروف پر تین نقطے

بنانے کا التزام نہیں پایا جاتا مثلاً "چور" (چور) "جلیا" (چلیا)، "جرھایا" (چڑھایا)، "سانب" (سانپ)، "بھول" (پھول)، "بھر" (پھر) وغیرہ۔ بعد کی بعض تصانیف میں بھی پ اور چ وغیرہ پر تین نقطے بنانے کا التزام نہیں پایا جاتا، مثلاً بہ قول پروفیسر مسعود حسین خاں ابراہیم نامہ میں "ج اور چ کے فرق کو بھی کاتب اکثر اوقات نظر انداز کر جاتا ہے۔"[۶۱]

غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے پ، چ وغیرہ پر پابندی کے ساتھ تین نقطے بنائے ہیں، لیکن بہ قولِ ڈاکٹر محمد انصار اللہ "ان کے معاصر لکھنے والوں میں بعض کے یہاں یہ التزام نہیں یا نسبتاً کم ملتا ہے۔"[۶۲]

نقطوں کے سلسلے میں 'نون' اور 'نونِ غنہ' کا ذکر بھی بیجا نہ ہوگا۔ اردو صوتیات میں /ن/ کی آواز ایک انفی مصمتہ ہے۔ اسے تحریر میں ظاہر کرنے کے لیے ن (نون) کا سہارا لیا جاتا ہے، جو اردو کا ایک مستقل حرف ہے۔ ن خواہ مفرد استعمال کیا جائے یا لفظ کی ابتدائی، درمیانی اور آخری حالتوں میں واقع ہو، یہ ہمیشہ نقطے کے ساتھ لکھا جاتا ہے نونِ غنہ، جس سے مصوتوں کی انفیت (غنائیت) ظاہر کی جاتی ہے جب مفرد یا لفظ کے آخر میں آتا ہے تو اس میں نقطہ نہیں بنایا جاتا۔ لیکن اُردو کی قدیم تحریروں اور مخطوطوں میں ابتدا ہی سے نونِ غنہ میں بھی نقطے کا استعمال پایا جاتا ہے۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اور ابراہیم نامہ سے لے کر کربل کتھا اور قصۂ مہر افروز و دلبر تک کے تمام مخطوطات میں، نیز غالب اور ان کے ہم عصروں کی تحریروں میں نونِ غنہ میں نقطے کا استعمال یکساں طور پر پایا جاتا ہے، مثلاً غالب نے اپنی تحریروں میں جہاں کہیں بھی میں، ہوں، وہاں، یہاں، خاں، جاں، نہیں وغیرہ الفاظ لکھے ہیں، نونِ غنہ میں پابندی کے ساتھ نقطے بنانے کا التزام کیا ہے۔

نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے نام اپنے بیشتر مکاتیب کے آخر میں غالبؔ نے ذیل کا شعر درج کیا ہے[۶۲]:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اس شعر کے مصرعۂ ثانی میں ہوں میں نونِ غنّہ پایا جاتا ہے، لیکن غالبؔ نے اسے نقطے کے ساتھ ہر جگہ "ہون" لکھا ہے۔ اسی طرح اپنے بعض خطوط میں غالبؔ نے یہ مصرعہ درج کیا ہے[۶۳]:

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں

یہاں بھی کہوں کے نونِ غنّہ میں نقطہ موجود ہے، یعنی ہر جگہ "کہون" لکھا گیا ہے۔ غالبؔ کے ایک خط کا اقتباس یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے جو انھوں نے ۲۷ر جولائی ۱۸۶۶ء کو لکھا تھا[۶۴]:

"مین ہزار بارہ سو روپیے کا قرض رکھتا ہون چاہتا ہون کہ میری زندگی مین ادا ہو جائے۔"

اس اقتباس میں "مین" (میں)، "ہون" (ہوں)، "مین" (میں) وغیرہ الفاظ میں باقاعدگی کے ساتھ نقطے لگائے گئے ہیں۔

نونِ غنّہ میں نقطے بنانے کا رواج بیسویں صدی کے وسط تک پایا جاتا ہے جناب رشید حسن خاں نے اردو املا (دہلی، ۱۹۷۴ء) میں مضامینِ شبلی کی چھٹی جلد (۱۹۵۱ء) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس میں کاتب صاحب نے اکثر مقامات پر لفظوں کے آخر میں آنے والے نونِ غنّہ میں اہتمام کے ساتھ نقطے لگائے ہیں[۶۵]۔"

## ۱۰

اردو رسمِ خط اور املا میں وقتاً فوقتاً بے شمار تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ املا کے اصول ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بعض حروف کی صورتوں میں برابر تبدیلیاں ہوتی

رہی ہیں۔ اردو اپنے معرضِ وجود میں آنے کے بعد صدیوں تک محض بول چال کی زبان کی حیثیت سے استعمال ہوتی رہی۔ دکن سے قطع نظر شمالی ہند میں اسے ضبطِ تحریر میں بہت بعد میں لایا گیا۔ اس وقت املا کے معیار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ افضل، فضلی، فائز اور دیگر مصنفین کی تحریروں میں املا کی جو بے قاعدگیاں پائی جاتی ہیں ان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بول چال کی زبان کو ان بزرگوں نے اچانک تحریر کا جامہ پہنا دیا، لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں، تا وقتیکہ کوئی زبان متواتر نہ لکھی جائے، اس کے رسمِ خط کا نہ تو معیار قائم ہو پاتا ہے اور نہ اس کے املا کے اصول ہی منضبط ہو پاتے ہیں۔ موجودہ دور میں اردو کتابت کے اصول کافی حد تک متعین ہو چکے ہیں اور املا کا معیار بڑی حد تک قائم ہو چکا ہے، تاہم رسمِ خط کی بے قاعدگیاں اب بھی بہت عام ہیں اور آج بھی املا کے بیشتر اصولوں کے بارے میں علماء میں اختلافِ رائے موجود ہے۔

# حواشی

۱۔ آرامی رسمِ خط، آرامی قوم کی ایجاد ہے جو قدیم زمانے میں ملکِ شام میں آباد تھی۔ آرامی رسمِ خط تقریباً تین ہزار سال پرانا ہے، کیوں کہ اس کے قدیم ترین کتبے ۸۰۰ قبلِ مسیح کے پائے گئے ہیں۔ عبرانی، نبطی، سریانی، سغدی، پہلوی اور کھروشٹی وغیرہ آرامی رسمِ خط ہی کی شاخیں ہیں۔

۲۔ عربوں اور ایرانیوں کے درمیان ۶۳۳ء سے لے کر ۶۴۱ء تک چار مشہور جنگیں ہوئیں: جنگِ ذات السلاسل (۶۳۳ء)، جنگِ قادسیہ (۶۳۵ء)، جنگِ جلولا (۶۳۷ء) اور جنگِ نہاوند (۶۴۱ء)۔ اس وقت ایران میں ساسانی حکومت قائم تھی اور پہلوی زبان کا چلن تھا۔ ان جنگوں میں ایرانی فوجوں کو پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا جس کے

نتیجے میں ساسانی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور ایران پر عربوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

۳۔ عربی میں پہلے کُل ۲۲ حروف تھے اور ترتیبِ ابجد کے لحاظ سے یہ اس طرح تھے:

ا ب ج د ہ و ز ح ط ی ک ل م ن س ع ف ص ق ر ش ت، یعنی ابجد ہوز حطی کلمن سعفص قرشت۔ بعد ازاں ۶ نئے حروف ث خ ذ ض ظ غ، یعنی ثخذ ضظغ کا اس میں اضافہ کیا گیا جس سے عربی حروف کی تعداد ۲۸ ہوگئی۔ اسی لیے ان حروف کو ترتیبِ ابجد کے آخر میں رکھا گیا ہے۔ 'ہمزہ' کا اضافہ بعد میں ہوا ہے۔ عربی لام الف (لا، لا) کی ایجاد بھی بعد کی چیز ہے۔

---

۴۔ محمد اسحاق صدیقی، فنِ تحریر کی تاریخ، طبع اوّل (علی گڑھ: انجمن ترقیِ اردو (ہند)، ۱۹۶۲ء)، ص ۲۰۹۔

۵۔ حسن بن حسین علی فارسی نے جو ایران کے ایک مشہور کاتب تھے چوتھی صدی ہجری میں خطِ رقاع اور خطِ توقیع کے امتزاج سے ایک نیا خط وضع کیا جو 'تعلیق' کے نام سے مشہور ہوا۔ خطِ رقاع، رقعات اور خطِ توقیع، توقیعات (فرامین) لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

۶۔ خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق کی بعض خصوصیات کے لیے دیکھیے رشید حسن خاں، 'اردو املا'، طبع اوّل (دہلی: نیشنل اکاڈمی، ۱۹۷۴ء)، ص ۴۸۱ ۔ ۴۹۹۔

۷۔ دیکھیے دکنی مخطوطات، مثلاً مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (نظامی بیدری)، قطب مشتری (ملا وجہی)، ابراہیم نامہ (عبدل دہلوی)، کتابِ نورس (ابراہیم عادل شاہ ثانی)، شمائل الاتقیا (میراں یعقوب) وغیرہ۔

۸۔ مسعود حسین خاں، اردو کا المیہ، مرتبہ: مرزا خلیل بیگ (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء)، ص ۴۷۔

۹۔ دیکھیے روزنامہ سالار (بنگلور)، شمارۂ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۴ء۔

۱۰۔ مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق (حصۂ دوم)، طبعِ اوّل (دہلی: انجمن ترقّیِ اردو (ہند) ۱۹۴۴ء)، ص ۸۸۔

۱۱۔ راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند، "کچھ بیان اپنی زبان کا"، مشمولہ اُردوئے معلّٰی (قدیم اُردو نمبر)، مرتبہ خواجہ احمد فاروقی (دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، س ن)، ص ۴۶-۴۷۔

۱۲۔ کہا جاتا ہے کہ ملک محمد جائسی کی تصانیف کی تعداد چودہ ہے، لیکن ان میں سے صرف تین ملتی ہیں، اکھراوٹ، پدماوت اور آخری کلام۔ باقی تصانیف کا کوئی نام و نشان نہیں۔ شک ہوتا ہے کہ وہ تھیں بھی یا نہیں (دیکھیے سیّد کلبِ مصطفٰے، ملک محمد جائسی، دہلی: انجمن ترقّیِ اُردو (ہند)، ۱۹۴۱ء، ص ۸۳)۔

۱۳۔ مسعود حسن رضوی ادیب، اردو زبان اور اس کا رسم خط، بارِ دوم (لکھنؤ: کتاب نگر، ۱۹۶۱ء)، ص ۵۵ [طبعِ اوّل ۱۹۴۸ء]۔

۱۴۔ دیکھیے سیّد عبداللہ کی تصنیف ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ۔

۱۵۔ محمد اسحاق صدیقی، تصنیفِ مذکورہ، ص ۲۲۲-۲۲۳۔

۱۶۔ دیکھیے محمد عزیر کی تصنیف اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصّہ۔

۱۷۔ دیکھیے گوپی چند نارنگ، "ہمزہ کیوں؟"، اردو میں لسانیاتی تحقیق، مرتبہ عبدالستار دلوی (بمبئی: کوکل اینڈ کمپنی، ۱۹۷۱ء)، ص ۱۶-۲۹۔

۱۸۔ اردو املا (دہلی، ۱۹۷۴ء) کے مصنف جناب رشید حسن خاں، آ (الف) کو حرفِ علّت کے علاوہ 'حرفِ صحیح' بھی مانتے ہیں، جو صوتیاتی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے وہ لکھتے ہیں:

"الف، واو، ی کبھی حروفِ صحیح ہوتے ہیں اور کبھی حروفِ علت۔"

(اردو املا، ص ۴۷)

اس سے پہلے اسی کتاب میں وہ ایک جگہ یہ عبارت لکھ چکے تھے:

"الف، واو، یے: اِن تین حرفوں کو "حروفِ علّت" کہا جاتا ہے۔ باقی حرف "حروفِ صحیح" کہلاتے ہیں۔ اِس سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہنا چاہیئے کہ اِن تینوں حرفوں کے کردار میں "دُہرا پن" پایا جاتا ہے اور وہ اِس طرح کہ جب یہ متحرک ہوتے ہیں، اُس وقت "حروفِ صحیح" کی طرح حرکات (زبر، زیر، پیش) کو قبول کرتے ہیں، اور یہ اِن کے کردار کا ایک رُخ ہوتا ہے، جیسے: اَب، وَطن، یَم۔ اِن لفظوں میں الف، واو، یے کا وہی عمل ہے جو دوسرے حروف کا ہوتا ہے۔ ہاں جب یہ ساکن ہوں گے، تب اِن کے کردار کا دوسرا رُخ نمایاں ہوگا اور اُس صورت میں یہ "حروفِ علّت" ہوں گے۔ جیسے: بڑا، بوٹ، بیٹ"

(اردو املا، ۴۳)

یہاں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اردو میں آ (الف)، صوتیاتی نقطۂ نظر سے ہمیشہ مصوتہ (حرفِ علّت) ہوتا ہے، خواہ وہ ساکن ہو یا متحرک۔ رشید حسن خاں صاحب کی پیش کردہ مثالوں میں "اَب" اور "بڑا" دونوں کا الف، مصوتے (حرفِ علّت) کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن خاں صاحب فرماتے ہیں کہ "اَب" کا الف چوں کہ متحرک ہے اِس لیے 'حرفِ صحیح' ہے اور "بڑا" کا الف چوں کہ ساکن ہے اس لیے 'حرفِ علّت' ہے۔ ان کی یہ دلیل صوتیاتی اعتبار سے ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اردو میں الف خواہ متحرک ہو یا ساکن، خواہ وہ لفظ کے شروع میں واقع ہو یا لفظ کے آخر میں، یا لفظ کے کسی منفصل جُزو کے آخر میں آئے، صوتیاتی اعتبار سے ہمیشہ مصوتہ (VOWEL) ہی ہوگا۔ نیز الف خواہ ممدودہ ہو یا مفتوح، مکسور ہو یا مضموم، اردو کے کسی بھی لفظ میں یہ مصمتے کی نمائندگی نہیں کرتا۔

صوتیاتی اعتبار سے "اَب" میں صرف دو آوازیں ہیں پہلی آواز /اَ/ کی ہے جو کہ

معوتہ (حرفِ علّت) ہے اور دوسری آواز /ب/ ایک مصمتہ (حرفِ صحیح) ہے۔ لفظ "بڑا" کے آخر میں جو الف آیا ہے وہ بھی ایک معوتہ ہے۔ لیکن یہ طویل معوتہ ہے اور "اَب" کا معوتہ ایک مختصر معوتہ ہے۔ اردو میں الف بہ اعتبارِ حرکات و سکنات کبھی مختصر معوتے کی نمائندگی کرتا ہے تو کبھی طویل معوتے کی لیکن کسی بھی صورت میں یہ مصمتے (حرفِ صحیح) کی نمائندگی نہیں کرتا۔

رشید حسن خاں صاحب نے "وطن" اور "یم" کی جو مثالیں دی ہیں ان میں واو اور ی کی حیثیت بھی محلاً حرفِ صحیح یعنی مصمتوں کی نہیں ہے، بلکہ نیم معوتوں (SEMI-VOWELS) کی ہے۔ ہاں "بوٹ" اور "بیٹ" میں یہ بے شک معوتے (حروفِ علّت) ہیں۔

۱۹ ۔ مسعود حسین خاں، "اردو صوتیات کا خاکہ"، "شعر و زبان" (حیدر آباد، ۱۹۶۶ء)، ص ۲۵۲۔

۲۰ ۔ جان ٹی پلیٹس، اے گرامر آف دی ہندستانی اور اردو لینگویج [ہندستانی یا اردو زبان کی قواعد]، پہلا ہندستانی ایڈیشن (دہلی: منشی رام منوہر لال، ۱۹۶۷ء)، ص ۴-۲، [طبعِ اول ۱۸۷۴ء]

۲۱ ۔ کربل کتھا (فضل علی فضلی)، مرتبۂ مالک رام اور مختار الدین احمد (پٹنہ: ادارۂ تحقیقاتِ اردو، ۱۹۶۵ء)۔

۲۲ ۔ قصۂ مہر افروز و دلبر (عیسوی خاں بہادر)، مرتبۂ مسعود حسین خاں (حیدر آباد، ۱۹۶۶ء)۔

۲۳ ۔ مثنوی وفات نامۂ بی بی فاطمہ (اسمٰعیل امروہوی)، مشمولۂ اردو کی دو قدیم مثنویاں، مرتبۂ نائب حسین نقوی (لکھنؤ: دانش محل، ۱۹۷۰ء)۔

۲۴ ۔ عاشور نامہ (روشن علی)، مرتبۂ مسعود حسین خاں اور سید سفارش حسین رضوی (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء)۔

۲۵ ۔ بکٹ کہانی (محمد افضل افضل)، مرتبۂ نور الحسن ہاشمی اور مسعود حسین خاں، طبعِ ثانی (لکھنؤ:

ادارۂ فروغ اردو ، ۱۹۷۰ء) ۔

۲۶ ۔ مثنوی معجزۂ انار (اسمٰعیل امروہوی) مشمولہ اردو کی دو قدیم مثنویاں ، مرتبہ نائب حسین نقوی (لکھنؤ : دانش محل ، ۱۹۷۰ء) ۔

۲۷ ۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (فخرِ دین نظامی) ، مرتبہ جمیل جالبی (دہلی : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ، ۱۹۷۹ء) ، [طبع اوّل ۱۹۷۳ء] ۔

۲۸ ۔ ابراہیم نامہ (عبدل دہلوی) ، مرتبہ مسعود حسین خاں (علی گڑھ : شعبۂ لسانیات ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، ۱۹۶۹ء) ۔

۲۹ ۔ "مقدمہ" عاشور نامہ ، مرتبہ مسعود حسین خاں اور سفارش حسین رضوی ، ص ۱۲ ۔ ۱۳ ۔

۳۰ ۔ قطب مشتری (ملا وجہی) ، مرتبہ مولوی عبدالحق (نئی دہلی : انجمن ترقی اردو (ہند) بی ان)

۳۱ ۔ "مقدمہ" ایضاً ، ص ۱۷ ۔

۳۲ ۔ "مقدمہ" مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ، مرتبہ جمیل جالبی ، ص ۲۷ ۔

۳۳ ۔ "مقدمہ" ابراہیم نامہ ، مرتبہ مسعود حسین خاں ، ص ۶۲

۳۴ ۔ "مقدمہ" عاشور نامہ ، مرتبہ مسعود حسین خاں اور سید سفارش حسین رضوی ، ص ۱۳ ۔

۳۵ ۔ "دیباچہ" اردو کی دو قدیم مثنویاں ، مرتبہ نائب حسین نقوی ، ص ۲۱ ۔

۳۶ ۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب ، فائز دہلوی اور دیوانِ فائز ، طبع دوم (علی گڑھ : انجمن ترقی اردو (ہند) ، ۱۹۶۵ء) طبع اوّل ۱۹۴۶ء ۔

۳۷ ۔ ایضاً ، ۱۴۷ ۔

۳۸ ۔ "مقدمہ" کربل کتھا ، مرتبہ مالک رام اور مختار الدین احمد ، ص ۳۲ ۔

۳۹ ۔ کربل کتھا ، مرتبہ مالک رام اور مختار الدین احمد ، ص ۲۸۳ ۔

۴۰ ۔ مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی ، صحیفۂ خوشنویساں (علی گڑھ : انجمن ترقی اردو (ہند) ، ۱۹۶۳ء) ، عکس نمبر ۱۴ ۔

۴۱ ۔ ایضاً، عکس نمبر ۲۸۔

۴۲ ۔ دیکھیے مرقعِ غالب، مرتبہ پرکاش چند (دہلی: ۱۹۶۶ء)، حصہ دوم (عکسِ خطوط نوشتۂ مرزا غالب بنامِ والیانِ رام پور، نواب یوسف علی خاں و نواب کلب علی خاں)۔

۴۳ ۔ دیکھیے رشید حسن خاں، تصنیفِ مذکورہ، ص ۵۶۱۔

۴۴ ۔ "مقدمہ"، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، مرتبہ جمیل جالبی، ص ۲۷۔

۴۵ ۔ "مقدمہ" ابراہیم نامہ، مرتبہ مسعود حسین خاں، ص ۴۳۔

۴۶ ۔ "مقدمہ" عاشور نامہ، مرتبہ مسعود حسین خاں، ص ۱۳۔

۴۷ ۔ "دیباچہ" اردو کی دو قدیم مثنویاں، مرتبہ نائب حسین نقوی، ص ۲۱۔

۴۸ ۔ "مقدمہ" کربل کتھا، مرتبہ مالک رام اور مختار الدین احمد، ص ۴۳۔

۴۹ ۔ دیوانِ فائز، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب، ص ۱۴۷۔

۵۰ ۔ "پیش نامہ" قصۂ مہر افروز و دلبر، مرتبہ مسعود حسین خاں، ص ۳۵۔

۵۱ ۔ "مقدمہ" مکاتیبِ غالب، مرتبہ امتیاز علی عرشی، ص ۲۲۰۔ بہ حوالہ رشید حسن خاں، اردو املا، ص ۶۴۳ (حاشیہ)۔

۵۲ ۔ ایضاً۔

۵۳ ۔ جارج اے۔ گریرسن، لنگوسٹک سروے آف انڈیا (لسانیاتی جائزۂ ہند)، جلد ۹، حصہ ۱ (دہلی: موتی لال بنارسی داس، ۱۹۶۸ء)، ص ۱۲۹ - ۱۳۰۔

۵۴ ۔ مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی، تصنیفِ مذکورہ، عکس نمبر ۲۷۔

۵۵ ۔ رشید حسن خاں، تصنیفِ مذکورہ، ص ۳۲۵۔

۵۶ ۔ جارج اے۔ گریرسن، تصنیفِ مذکورہ، ص ۱۱۷۔

۵۷ ۔ "مقدمہ" ابراہیم نامہ، مرتبہ مسعود حسین خاں، ص ۶۲۔

۵۸ ۔ مسعود حسین خاں، اردو کا المیہ، مرتبہ مرزا خلیل بیگ (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء)، ص ۷۴۔

۵۹۔ دیکھیے مرقعِ غالب، مرتبۂ پرکھوی چند، حصۂ دوم۔

۶۰۔ جان ٹی۔ پلیٹس، تصنیفِ مذکورہ، ص ۲ (حاشیہ)۔

۶۱۔ "مقدمہ" ابراہیم نامہ، مرتبۂ مسعود حسین خاں، ص ۶۳۔

۶۲۔ محمد انصار اللہ، اردو کے حروفِ تہجی (کرطبہ: ادارۃ المخدوم، ۱۹۷۲ء)، ص ۲۷۔

۶۳۔ دیکھیے مرقعِ غالب، مرتبۂ پرکھوی چند، حصۂ دوم۔

۶۴۔ ایضاً۔

۶۵۔ رشید حسن خاں، تصنیفِ مذکورہ، ص ۱۸۹۔

(۱۹۷۸ء، نظرِ ثانی ۱۹۸۴ء)

# لسانیاتی اصطلاحات

| | |
|---|---|
| ابجد / ہجا | ALPHABETS |
| ابجدی | ALPHABETIC |
| اتصال | JUNCTURE |
| اجزا | CONSTITUENTS |
| اسم | NOUN |
| اسم مصدر | GERUND |
| اشارہ | GESTURE |
| اشتقاق | DERIVATION |
| اشتقاقی | DERIVATIONAL |
| اختتامی | TERMINAL |
| اخیریہ | ENDING |
| اقلی اتصال | MINIMAL JUNCTURE |
| اقلی جوڑا | MINIMAL PAIR |
| اکائی | UNIT |
| اگلا مصوتہ | FRONT VOWEL |
| انحراف | DEVIATION |
| انضمام | MERGER |
| انفی | NASAL |
| انفیت | NASALIZATION |
| بازتعمیر | RECONSTRUCTION |
| بامعنی | MEANINGFUL |
| بٹوارہ / تقسیم | DISTRIBUTION |
| بندشیہ | STOP |
| بولی | DIALECT |
| پچھلا مصوتہ | BACK VOWEL |
| پہلوئی | LATERAL |
| پھوٹ | SPLIT |
| تالوئی | PALATAL |
| تبدیلی | CHANGE |
| تجزیہ | ANALYSIS |

| اردو | English |
|---|---|
| ترسیل | COMMUNICATION |
| ترسیم | GRAPH |
| ترمیم | MODIFICATION |
| تشکیل | FORMATION |
| تشکیلی | FORMATIVE |
| تصریف | INFLECTION |
| تصریفی | INFLECTIONAL |
| تغیّر | VARIATION |
| تقابلی | COMPARATIVE |
| تخالفی | CONTRASTIVE |
| تقسیم/درجہ بندی | CLASSIFICATION |
| تقلیب (صوتی) | METATHESIS |
| تکرّر | FREQUENCY |
| تکریری | REDUPLICATIVE |
| تکلم/کلام | SPEECH |
| تلفظ | ARTICULATION |
| تلفظی | ARTICULATORY |
| جملہ | SENTENCE |
| جنس | GENDER |
| چوٹی | PEAK |
| حالت | CASE |
| حالتِ اضافی | GENITIVE CASE |
| حالتِ غیر فاعلی | OBLIQUE CASE |
| حالتِ فاعلی | DIRECT CASE |
| حالتِ مفعولی | ACCUSATIVE CASE |
| حذف | ELISION |
| حرف | LETTER |
| حلقی | PHARYNGAL |
| دخول | INTRUSION |
| درجہ | CLASS |
| دندانی | DENTAL |
| دولسانی | BILINGUAL |
| دولبی | BILABIAL |
| دُہرا مصوتہ | DIPHTHONG |
| ڈھانچا/ساخت | STRUCTURE |
| ذخیرۂ الفاظ | VOCABULARY |
| رسمِ خط | SCRIPT |
| رُوپ/ہیئت | FORM |
| زبان | LANGUAGE |
| زور | STRESS |
| سابقہ | PREFIX |
| سمعی | ACOUSTIC |
| صرف/علم الصرف | MORPHOLOGY |
| صرفیہ | MORPHEME |
| صوت | SOUND |
| صوت رکن | SYLLABLE |
| صوت رکنی | SYLLABIC |
| صوتی/صوتیاتی | PHONETIC |

| | |
|---|---|
| PHONETICS | صوتیات |
| PHONETIC CHANGE | صوتی تبدیلی |
| PHONETIC SCRIPT | صوتی رسم خط |
| PHONEME | صوتیہ |
| PHONOLOGY | صوتیہ یات |
| CLASS DIALECT | طبقاتی بولی |
| PASSIVE VOICE | طورِ مجہول |
| ACTIVE VOICE | طورِ معروف |
| LONG | طویل |
| SYMBOL | علامت |
| ETYMOLOGY | علم الاشتقاق |
| VELUM | غشا |
| VELAR | غشائی |
| NASALIZATION | غنائیت |
| VOICELESS | غیر مسموع |
| UNASPIRATED | غیر ہائیہ/غیر ہکار |
| VERB | فعل |
| VERBAL | فعلی |
| SEGMENTATION | قطع کاری |
| SEGMENT | قطعہ |
| SPEECH | کلام/تکلم |
| SPEECH SOUNDS | کلامی اصوات |
| SPEECH HABITS | کلامی عادت |
| PARADIGM | گردان |
| SONORITY | گونج |
| SONOROUS | گونجدار |
| SUFFIX | لاحقہ |
| LABIAL | لبی |
| LINGUISTICS | لسانیات |
| LINGUISTIC | لسانی/لسانیاتی |
| UVULAR | لہاتی |
| ACCENT | لہجہ |
| ROOT | مادّہ |
| FROTO | ماقبل |
| COGNAT | متجانس |
| COMPOUND | مرکب |
| HYPOTHESIS | مفروضہ |
| ROUNDED | مدوّر |
| BORROWED | مستعار |
| VOICED | مسموع |
| GEMINATED | مشدّد |
| INFINITIVE | مصدر |
| CONSONANT | مصمتہ |
| CONSONANT CLUSTER | مصمتی خوشہ |
| VOWEL | مصوتہ |
| VOWEL— | مصوتی |
| RETROFLEX | معکوسی/کوز |
| SEMANTICS | معنیات |

# اشاریہ

## (اشخاص)

کتبہ:۔ سلطان احمد، نئی مسجد، جمال پور

نام : مرزا خلیل احمد بیگ ۔
پیدائش : ۱۹۴۵ء، گورکھ پور ۔
تعلیم : ایم ۔ اے ، پی ایچ ۔ ڈی (علیگ) ۔
ملازمت : استاد شعبۂ لسانیات ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ ۔
سابق پرنسپل ، اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر ، سولن ۔
تصانیف : اردو کی لسانی تشکیل (۱۹۸۵ء) ۔
آیئے اردو سیکھیں (۱۹۸۵ء) ۔
زبان ، اُسلوب اور اُسلوبیات (۱۹۸۳ء) ۔
پڑھو اور بڑھو (۱۹۸۳ء) ۔
(بہ اشتراکِ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور دیگر) ۔
اردو سابقے اور لاحقے (۱۹۷۹ء) ۔
اردو کا لسانی ارتقا ، شمالی ہند میں (غیر مطبوعہ) ۔
اردو کے آغاز و ارتقا کے مسائل (غیر مطبوعہ) ۔
اُسلوبیاتی تنقید (غیر مطبوعہ) ۔
اکابرِ لسانیات (زیرِ ترتیب) ۔
سماجی لسانیات (زیرِ ترتیب) ۔
ادب ، تنقید اور لسانیات (زیرِ طبع) ۔
اردو کے لسانی مسائل (زیرِ طبع) ۔
اُسلوبیاتی تجزیے (زیرِ طبع) ۔
تاریخی لسانیات : ایک تعارف (ترجمہ) ۔
اردو کا المیہ (پروفیسر مسعود حسین خاں) ، مرتبہ (۱۹۷۳ء) ۔
رکن : امتحان کمیٹی ، جامعۂ اردو ، علی گڑھ ۔
وضعِ اصطلاحات کمیٹی برائے لسانیات ، ترقی اردو بیورو ، نئی دہلی ۔
پتا : فیصل وِلا ، سرسیّد نگر ، علی گڑھ

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کی معرکۃ الآرا تصنیف

# زبان، اُسلوب اور اُسلوبیات

اُسلوبیات کا آغاز اس صدی کی چھٹی دہائی سے ہوتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں ٹامس اے سبیوک کی مرتب کردہ کتاب اسٹائل اِن لینگویج کی اشاعت سے اس کے خط و خال متعین ہوتے ہیں اور اس کے بعد کے اُسلوبیاتی مطالعوں اور تجزیوں سے اس کا وجود اطلاقی لسانیات کی ایک اہم شاخ کی حیثیت سے مسلّم ہو جاتا ہے۔

پچھلے دو تین دہوں کے دوران اُسلوبیات سے متعلق انگریزی اور اُردو میں جتنے بھی اہم کارنامے منظرِ عام پر آئے ہیں ان کا ایک مبسوط جائزہ اس کتاب کے پہلے مضمون میں پیش کیا گیا ہے، نیز اسی مضمون میں زبان و ادب، اور ادب و لسانیات کے باہمی رشتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد کے چار مضامین اردو شعر و ادب کے اُسلوبیاتی تجزیوں پر مشتمل ہیں۔ آخری دو مضامین میں اُسلوبیات کے معنی و مفہوم، اُسلوبیاتی طریقِ کار، اور اُسلوب کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔

اُردو میں غالباً یہ پہلی کتاب ہے جو قاری کو نہ صرف 'لسانیاتی اُسلوبیات' سے متعارف کراتی ہے، بلکہ اُسلوبیاتی تجزیوں کے مختلف نمونے بھی پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ادب اور لسانیات کے باہمی رشتوں، نیز ادب کے مطالعے میں لسانیات کے اطلاق اور مطالعۂ شعر کے لسانیاتی و اُسلوبیاتی پہلوؤں کی افہام و تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ کتاب مطالعۂ ادب کی ایک 'نئی سمت' اور تنقیدِ شعر کی ایک 'نئی جہت' متعین کرتی ہے۔


ادارۂ زبان و اُسلوب

فیصل ولا، سرسید نگر، علی گڑھ